راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 25واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ:
عامر بن علی

مدیران:
حسن عباسی، لبنیٰ صفدر

ستمبر ۲۰۲۴ء

صنفِ سخن کوئی بھی ہو مگر اصل چیز فن ہے اور فن مشکل ہوتا ہے

ادبی پس منظر کے بغیر ڈرامہ لکھنے والے اس کے زوال کا سبب ہیں

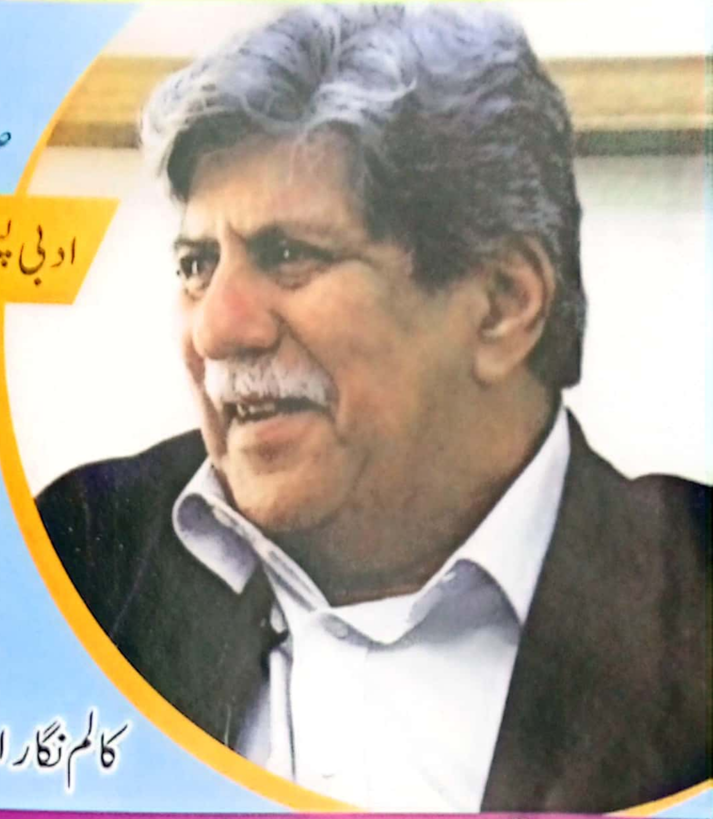

عہد ساز ڈرامہ نگار، مقبول شاعر، ادیب، کالم نویس اور استادِ فن

اصغر ندیم سید

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفر نامہ نگار **عامر بن علی** کی خصوصی گفتگو

بدقسمتی سے آج ٹی وی ڈرامے کی ترجیحات ایڈورٹائزر طے کر رہا ہے

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی درگاہ پر ان کا صوفی کلام گانے کے لئے جیسے سات سورمائیں ہوتی ہیں، ویسے ہی اگر پاکستان میں ڈرامہ نگاری کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں بھی سات سورما ہیں، ان سات سورماؤں میں سے ایک اصغر ندیم سید ہیں۔ اردو زبان میں ڈرامہ نویسی کا تذکرہ ان کے ذکر کے بغیر ادھورا ہی رہتا ہے۔ نصف صدی سے مسلسل قلم کے ذریعے ہمارے معاشرے کو ایک بہتر سماج بنانے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ صف اول کے کالم نگار ہیں، خوبصورت لہجے میں شاعری کرتے ہیں، عمر کا بہترین حصہ تدریس میں گزارا ہے۔ ایسے سخن ور جنہوں نے ایک پوری نسل کی ادبی تربیت کی ہے اور ہمیشہ ایک جداگانہ طرزِ تحریر اپنایا ہے، جو انہی کا خاصہ ہے۔ مزید تعارفی کلمات سے اس لئے بھی گریز کروں گا کہ وہ واقعی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، بہتر ہو گا کہ ان سے کی جانے والی گفتگو قارئین کرام کے ذوق مطالعہ کی نذر کی جائے۔

س:۔ زندگی کی ابتداء سے بات شروع کرتے ہیں۔ بچپن کہاں اور کیسے گزرا، ابتدائے سخن کیسے ہوئی اور اس کا ارتقاء کیسے ہوا؟

ج:۔ میرا بچپن ملتان میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم ملتان سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج ملتان ہمیشہ سے عمدہ روایت کا امین رہا ہے۔ میری ابتدائی تربیت ادب اور فنون لطیفہ کے ماحول میں ہوئی۔ میں نے ایم اے کے زمانے سے لکھنا شروع کیا۔ بعد میں وہاں کالج میں کچھ عرصہ پڑھایا۔ پھر لاہور کی طرف آ گیا۔ یہاں لاہور میں اشفاق احمد، کشور ناہید، امجد اسلام امجد جیسے ارباب ذوق موجود تھے۔ پھر ادبی ماحول میں حلقۂ ارباب ذوق کے ساتھ منسلک رہا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں آ گیا۔ بعد میں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے لگے اس دور میں ادبی ماحول کا رجحان تھا۔ محفلوں میں ادبی گفتگو، مکالمہ، ڈائیلاگ کا رواج تھا۔ 1980 میں ٹی وی سے منسلک ہوا، اسی دوران کنور آفتاب نے ڈرامہ لکھوایا پھر رموز، دریا، آسمان، پیاس، خواہش، چاند گرہن اور یہ سلسلہ چلتا ہی گیا۔

س:۔ ایک ڈرامہ نویس کے لئے تحقیق اور مشاہدہ کیوں ضروری ہے؟ کیا ایک اچھا ڈرامہ نویس اپنے عام مشاہدے کو سامنے رکھتے ہوئے ڈرامہ تحریر کرتا ہے یا تجرباتی مشاہدے یا تجرباتی تحقیق کو سامنے رکھتے ہوئے؟

ج:۔ ڈرامہ نویس ہوا میں بیٹھ کر ڈرامہ نہیں لکھ سکتا۔ ڈرامہ صرف فن ہی نہیں آگہی و بصیرت بھی ہے۔ ڈرامہ نویس کا معاشرے، ملک اور دنیا کے بارے میں وژن ہونا چاہیے۔ جب تک مخصوص رویوں اور Dialectic کو نہ سمجھا جائے، ڈرامہ نویس مخصوص معاشرتی مسائل اجاگر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ڈرامہ نویس کا مطالعہ مشاہدہ، تجربہ لکھنے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ڈرامہ نویس کو علم کی روایات، سیاست، معاشیات اور ثقافت سے جڑنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں کئی کلچرل یونٹس ہیں۔ مختلف زبانیں، لہجے اور انداز ہیں ان تمام کو سمجھے بغیر ڈرامہ نویس ڈرامہ نہیں لکھ سکتا۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 25واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

MONTHLY Arzang LAHORE

ستمبر 2024ء شمارہ 9

مدیرِ اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
- سعدیہ سیٹھی

مجلسِ مشاورت
- ظفر خان (آسٹریلیا)
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹو گرافر: نعمان حسن 0333-4918383

سرورق: لبنیٰ صفدر

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبائل کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ' 2

مضامین:

- ولی کامل حضرت صدیق ساجد علویؒ / جسٹس (ر) میاں نذیر اختر ' 4
- ادب کیا ہے؟ / ڈاکٹر محمد خاں اشرف ' 8
- مغربی تہذیب کا معاشرتی انحطاط / پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن ' 11
- ابرار ندیم کی کالم نگاری / اصغر ندیم سیّد ' 13
- مشاعرے کی روایت اور ماہنامہ "شاعر" / اعجاز خاور ' 17

نعتیہ گوشے: ڈاکٹر افتخار الحق ارقم ' ڈاکٹر ایوب ندیم ' 18 تا 19

مضامین:

- روشنی کی جھلمل میں طمطناتی شاعری / عبدالوحید بسمل ' 20
- جدید غزل کا موضوعاتی مطالعہ / لبنیٰ صفدر ' 23

طرحی غزل: احمد ندیم ' 25

بقیہ انٹرویو: اصغر ندیم سیّد ' 27

بقیہ انٹرویو: فقیر اللہ خاں ' 28

شاعری: ' 31

سفرنامہ: ○ قانون کی حکمرانی ہی واحد فرق ہے / عابد حسین قریشی ' 34

- شکستہ ظروف کا سنہرا سفر / عامر بن علی ' 36

افسانے: ○ پری چہرہ......! / بشریٰ رحمٰن ' 36

- فضل منزل / مسعود مفتی ' 40
- خلاء / نیلم احمد بشیر ' 43
- بڑا فنکار / انجینئر ظفر محی الدین ' 49
- درویش / محمد شفیق ' 50
- زندگی اور محبت / جواہرہ سعید قریشی ' 53
- جلال الدین خوارزم شاہ سندھ میں / مرزا کاظم رضا بیگ ' 54
- ادبی خبریں ' 56

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد باری تعالیٰ

اللہ نور خود ہے خالق بھی نور کا ہے
لاریب وہ ہی مالک یومِ نشور کا ہے
شمس و قمر ستارے امرِ خدا کے مظہر
ہر ایک شے میں جلوہ خالق کے نور کا ہے
حاضر وہی ہے ہر جا لیکن نظر سے پنہاں
انداز کیا نرالا اس کے ظہور کا ہے
ارض و سما میں ہر سو حُسن و بہا اسی سے
ہر اِک جہان مظہر اس کے ہی نور کا ہے
مسجود وہ حقیقی ، معبود وہ ہی تنہا
حاکم وہی حقیقی سارے اُمور کا ہے
سنتا ہے وہ ہی اختر مخلوق کی دُعائیں
سب پہ کرم جہاں میں ربِّ غفور کا ہے

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

حمد

تمام خلقتِ گیتی ہے مرتبے میں قبیل
ہر ایک بندۂ خالق کا تو ہی ربِ جلیل
عطائے خالقِ کونین تیری حکمت ہے
ہر اک نفس کو ملی تیرے فیض کی ترسیل
سکونِ روح بھی تو باعثِ قرار بھی تو
زبانِ شعر و سخن کو ملی ہے فکرِ جمیل
یوں بارگاہِ محبت میں ایسے رنگ کھلے
کہ میرے غنچۂ دل میں جلی ہے اک قندیل
اک اہتمامِ بصیرت ہے یہ نظامِ حیات
عیاں ہے ذوقِ نظارہ بصیرتوں کی دلیل
عطائے خاص ہے تیری جو اہلِ زیرک پہ
کہ بے نوا بھی بنے ہیں جہاں میں تیرے کفیل
ترے ہی اِذن سے پھولوں میں خوشبوئیں مہکیں
کہ آب و گل بھی ہیں جلوہ نمائے ربِّ جلیل
جہانِ عشق و محبت عقیق رنگ ہوا
ملی ہے وصل کو تیرے خلوص کی ترسیل
ہر اک نفس بھی تو اب حکمِ کردگار میں ہے
تیرے سوا تو کوئی بھی نہیں ہے میرا عدیل
تری ثنا ہی تو مولا مرا حوالہ ہے
یہی ہے زادِ سفر حشر میں اے ربِّ جلیل
ہر اک وجود بھی سوچوں ترے حصار میں ہے
کرم کی ملتجی بسمل کرے ہے تجھ سے اپیل

بسمل صابری/ساہیوال

نعت بحضور سرورِ کونینؐ

ہے لازمی درود مسلسل پڑھا کریں
اس طرح اپنے دکھ کا مداوا کیا کریں
خونِ جگر سے اُن کا لکھیں نام بار بار
طے اس طرح بھی درد کا ہر مرحلہ کریں
صلِ علیٰ وہی ہیں وہی احمدؐ رُسل
منصب ہیں وہ انہی کے سہارے جیا کریں
یہ طے ہے ہر مراد ملے ان کے نام پر
ٹوٹے کبھی نہ رابطہ اُن سے دُعا کریں
کتنے کٹھن سفر ہوں کوئی معرکہ بھی ہو
عالم میں جذب و شوق کے ہر دم رہا کریں
ڈھارس غمِ حسین ہے اب وجہ زندگی
ہر اک قدم پہ پیروی کربلا کریں
بھیجوں سلام اُن پہ یہ میری بساط کیا
شامِ فرات آ تجھے آ ہم نوا کریں
مالک ہے دو جہان کا کرتا ہے بخششیں
شامِ طلب سے تا بہ سحر اب دُعا کریں
آنکھوں میں اشک لے کے چلی اپنی زندگی
بسمل تمام حال ذرا عرضِ شاہ کریں

بسمل صابری/ساہیوال

کہاں مدحتِ محمدؐ مرا یہ قلم قصیدہ
مرا روگ بے نوائی مرے لفظ آبدیدہ
یہ مری خیال صورت کہاں پُر جمال صورت
نہیں لائقِ ستائش مری عمر کا جریدہ
یہ ہوا تو چل پڑی ہے کوئی عذر ہے، کمی ہے
یہ بتاؤ! کیوں ابھی ہے مری چشم نارسیدہ؟
دل و جان پر سوا ہے یہ جو بُعد کی سزا ہے
تو فدائے مصطفیٰؐ کے یہاں دست و پا بریدہ؟
رہا یوں ہی بے قرینہ مجھے آ سکا نہ جینا
مجھے کر سگِ مدینہ میں نہیں ہوں سرکشیدہ
میری جان جل رہی ہے یہ کہاں سنبھل رہی ہے
غم و کربِ نارسائی سے وجود ہے تپیدہ
وہی دید در کی حسرت وہی آنسوؤں کی کثرت
ستم عمر کر رہی ہے یہ قویٰ مرے خمیدہ
کہ اسیرِ فکر و فن ہیں تو یہ لوگ طعنہ زن ہیں
ہمی روز و شب گزیدہ کہ جئیں تو چیدہ چیدہ
مجھے مستنیر کر دے کہ مجھے منیر کر دے
میں ہوں شوقِ حاضری سے یہاں خاطر کبیدہ

گستاخ بخاری

زہاں کو وصف درود و سلام چاہیے ہے
نظر کو روضۂ خیرالانامؐ چاہیے ہے

اسی میں راز ہے پنہاں مری فضیلت کا
مجھے غلاموں میں ادنیٰ مقام چاہیے ہے

کچھ اس لیے بھی مدینے کی رہ گزر میں ہوں
کہ مجھ کو لذتِ کیفِ دوام چاہیے ہے

یہ بارگاہِ رسالت ہے، ہر قدم پہ یہاں
نگاہِ شوق بہت احترام چاہیے ہے

وہ جس دیار میں مسکن ہے میرے آقا کا
تمام عمر وہیں تو قیام چاہیے ہے

خدائے لوح و قلم مدحتِ نبیؐ کے لیے
سخن کے باب میں کچھ اہتمام چاہیے ہے

انھی کے کوچے میں کٹ جائے زندگی کہ مجھے
فضائے شہرِ مدینہ مدام چاہیے ہے

نہ چاہیے مجھے دنیا میں مرتبہ کچھ بھی
جو چاہیے تو گداؤں میں نام چاہیے ہے

عجیب کیفِ عبادت ہے انؐ کے روضے پر
اُسی فضا میں سجود و قیام چاہیے ہے

جہاں میں بھی مری نسبت رہی ہے ان سے رضا
اسی حوالے سے محشر میں نام چاہیے ہے

علی رضا/ساہیوال

منبعِ مہر و کرم، جُود و سخا، یا مصطفیٰؐ!
ہو نظر، اے منبعِ لطف و عطا، یا مصطفیٰؐ!

مہ جبین و دل نشین و دل کشا، یا مصطفیٰؐ!
دل گداز و دل نواز و دل رُبا یا مصطفیٰؐ!

خیر خواہِ جنّ و انساں، خیر خواہِ اُمتاں!
آپؐ ہیں خیر البشر، خیر الوریٰ یا مصطفیٰؐ!

طیبہ کے مہرِ درخشاں، ماہِ تابانِ حرا
ہو منور دل کہ ہے ظلمت کدہ، یا مصطفیٰؐ!

چارہ سازِ بے نصیباں، چارہ سازِ بے کساں
ہو کرم اے چارہ گر، مشکل کشا، یا مصطفیٰؐ!

مرحبا، ہم کو بنا دیں خوش طبیعت، خوش چلن
خوش نظر، اے خوش بصیرت، خوش ادا، یا مصطفیٰؐ!

ظلمتوں سے منزلیں محفوظ ہوں گی کب تلک؟
ہوگا اُجالا کب تلک یہ راستہ، یا مصطفیٰؐ!

نام لیواؤں پہ تیرے قیصروں کے ظلم کا
سرد ہوگا کب تلک آتش کدہ، یا مصطفیٰؐ!

دیکھیں گے ''رحمت لقب'' کے ناز کو ہم حشر میں
پوچھے گا جب خود خدا، کیا ہے رضا، یا مصطفیٰؐ!

آپؐ ہیں عالی امامِ انبیاء، معراجِ شب
مقتدی سب آپ کے ہی انبیاء یا مصطفیٰؐ!

مجھ کو بھی اپنی محبّت کی عطا خیرات کر
از طفیلِ فاطمہؓ خیرالنساءؓ، یا مصطفیٰؐ!

ہے سہارا زائرِ بے آسرا کو دہر میں
عاقبت میں بھی ترا ہی آسرا، یا مصطفیٰؐ!

عبدالقیوم زائر/امریکا

شمعِ توحید کی سرکار جلانے آئے
یعنی ظلمات کا ہر نقش مٹانے آئے

میں نے ہونا تھا محمدؐ کا سو میں ہو بھی چکا
ایسے بے کار میں دنیا مجھے پانے آئے

جب بھی دھتکار کے دنیا مجھے تنہا کر دے
آپ کی یاد مجھے دل سے لگانے آئے

نعت کہنا تھی ''کہا'' صلی علیٰ سیدنا
لفظ یک دم لیے نعتوں کے خزانے آئے

آپ ہی تو شبِ ہلدا کے قفس سے آخر
صبحِ بے تاب کو آزاد کرانے آئے

کون سی خلق ہے طیبہ جو نہ آتی ہوگی
ہر کوئی دل کی یہاں پیاس بجھانے آئے

کاش سو جاؤں انھیں یاد میں کرتے ہوئے شمسؔ
اور طیبہ کی ہوا مجھ کو جگانے آئے

زاہد محمود زاہد/ملتان

لیے ہوئے ہے ہمیں زیرِ دام تاریکی
مٹائے دیجیے ماہِ تمام! تاریکی

ہمارے ملک کی حالت بھی دیکھیے آقا
نظامِ کار ہے تیرہ نظام تاریکی

امیدِ صبحِ منور پہ پانچ سال کے بعد
خرید لیتے ہیں پھر سے عوام تاریکی

متاعِ سود و ہوا و ہوس کی کثرت سے
پکڑتی جائے ہے دل میں دوام تاریکی

اے روشنی کے پیمبر بس ایک نوریں جھلک
ہوئی ہی جاتی ہے دنیا میں عام تاریکی

طفیلِ گنبدِ خضریٰ ہو بارشِ انوار
کہ ایک آن میں ہو سبز فام، تاریکی

خدایا بھیج کوئی ایسا حکمران کہ جو
بدل دے روشنیوں میں تمام تاریکی

چراغِ اسوۂ احمد اگر نہ ہاتھ میں ہو
دکھائی دینے لگے گام گام تاریکی

حسنین مظہری/لاہور

منقبت

سیّدالشہداء امامِ عالی مقام سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ

اپنا سارا گھر لٹایا ہے مرے شبیرؓ نے
سر کٹا کے دیں بچایا ہے مرے شبیرؓ نے

کلمۂ حق دیکھیے تو کافروں کے سامنے
زیرِ خنجر بھی سنایا ہے مرے شبیرؓ نے

کفر کی یلغار سے جو بجھ رہا تھا حق کا دیپ
اپنے خوں سے پھر جلایا ہے مرے شبیرؓ نے

یوں تو قاری ہیں جہاں میں دیکھیے قراں فقط
نوکِ نیزہ پر سنایا ہے مرے شبیرؓ نے

ساری اُمت کے ہیں سجدے ایک سجدے پر نثار
جیسا سجدہ کر دکھایا ہے مرے شبیرؓ نے

بخش دی جاوید عزت کربلا کی خاک کو
اس پہ اپنا گھر بنایا ہے مرے شبیرؓ نے

جاوید منظور/لاہور

ولیِ کامل حضرت محمد صدیق ساجد علویؒ

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

عظیم عاشقِ رسول، محمد صدیق ساجد علویؒ کی اس عالمِ فنا میں آمد یکم فروری 1931ء کو ہوئی، آپ کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا فرمائی اور بالآخر آپ 16 جون 2024ء کو (یو۔کے میں) عالمِ بقا کو سدھارے۔ ان کا جسدِ خاکی اسلام آباد لایا گیا جہاں 22 جون 2024ء کو ان کی نمازِ جنازہ بعد نمازِ ظہر ادا کی گئی جس میں ان کے اعزّہ و اقربا اور احباب کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ ان کی تدفین H-11 قبرستان نزد پولیس لائن اسلام آباد میں ہوئی۔

حضرت ساجد علویؒ اپنی زندگی کے ہر دور میں نمایاں حیثیتوں پر فائز رہے۔ بطور طالب علم، کامیابیاں سمیٹتے ہوئے انہوں نے ایم اے (فارسی)، بی ٹی تک تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج چکوال میں پروفیسر رہے۔ ایک دور میں انہیں گورنمنٹ کالج پارہ چنار میں ٹرانسفر کیا گیا جہاں انہوں نے دو سال تک درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس دور میں وہ پارہ چنار کالج میں مشاعروں اور محافلِ نعت کا اہتمام فرماتے رہے۔ ان کی کاوشوں سے اس دور اُفتادہ علاقے اور کرم ایجنسی میں شعر و ادب اور محافلِ نعت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ آپ نے طویل عرصہ تک بطور سبجیکٹ سپیشلسٹ فرائض سرانجام دیئے۔ انہیں ترقی دے کر پرنسپل گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول کوٹلی ستیاں تعینات کیا گیا مگر آپ نے ذاتی وجوہات کی بنا پر 1988ء میں قبل از وقت ریٹائر منٹ لے لی۔ بعد ازاں کچھ عرصہ تک انہوں نے پاکستان انٹرنیشنل ہائیر سیکنڈری سکول، ریاض سعودی عرب میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔

وہ سنِ شعور سے بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کا ادب کرتے تھے۔ انہیں حضرت پیر مہر علی شاہؒ سے انتہائی عقیدت تھی۔ وہ بارہا ان کے در اقدس پہ حاضر ہو کر فیوض و برکات کے خزانے سمیٹتے رہے۔ بعد ازاں انہیں حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب کے فرزندِ ارجمند حضرت پیر سیّد غلام محی الدین گیلانی عرف قبلہ بابو جی کے دستِ مبارک پر بیعت نصیب ہوئی۔ ان کی فطرتِ سلیم میں روحانیت کی برکات پہلے ہی موجود تھیں جو مُرشد کی خصوصی توجہ اور برکات سے فزوں تر ہو گئیں۔

انہیں پہلے عمرے کی سعادت 1989ء میں حاصل ہوئی۔ عمرے کے بعد وہ بصد عقیدت و محبت مدینہ طیبہ پہنچے اور بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے۔ ایک روز انہیں ریاض الجنۃ میں حاضری نصیب ہوئی تو وہ تا دیر بارگاہِ الٰہی میں اپنی دعائیں پیش کرتے رہے۔ اگلے روز وہ پھر ریاض الجنۃ میں حاضر ہوئے اور حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں ہدیہ درود و سلام پیش کیا تو سرکار ﷺ نے انہیں سلام کا جواب دیا اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا "تمہاری کل کی ساری دعائیں مستجاب ہیں"۔ یوں انہیں پہلی مرتبہ حضور نبی اکرم ﷺ کی آوازِ مبارک کی سماعت نصیب ہوئی۔ انہیں 1989ء میں ہی حج کرنے اور بعد ازاں متعدد بار عمرے کرنے کی سعادتیں حاصل ہوئیں۔ انہیں خانہ کعبہ کے اندر چار مرتبہ داخل ہونے اور بیت اللہ شریف کے چاروں کونوں میں نوافل ادا کرنے کا عظیم اعزاز بھی حاصل ہوا۔

ایک بار میں ان کے گھر واقع اسلام آباد میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا، میں نے دیکھا کہ ان کے ڈرائنگ روم میں خوبصورت سفید موتیوں میں پرویا ہوا یہ درودِ پاک آویزاں تھا۔ "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِنِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ"۔ میں نے اس کے بارے میں حضرت علوی صاحبؒ سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ یہ درود شریف کثرت سے پڑھا کرتے تھے، اس درود پاک کو حضور نبی اکرم ﷺ نے پسند فرمایا اور حکم دیا کہ تم یہی درود پاک پڑھا کرو۔ اس حکم کے بعد انہوں نے اس درودِ پاک کا وظیفہ زیادہ ذوق شوق سے جاری رکھا۔

رفتہ رفتہ سلوک کی منازل طے کرتے ہوئے بالآخر انہیں بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں مقامِ حضوری نصیب ہو گیا۔ اس سعادتِ عظمیٰ کے گواہ ہمارے ممدوح حضرت ساجد علویؒ کے فرزندانِ گرامی (محترم ڈاکٹر شاہزاد احمد علوی۔ محترم فیض احمد علوی۔ محترم نثار احمد علوی) اور ان کی نیک سیرت اہلیہ محترمہ ہیں۔ ان کے بقول حضرت ساجد علویؒ روحانی طور پر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے تھے، وہ شب کو باوضو ہو کر اور صاف ستھرا لباس زیب تن کر کے اپنے کمرے میں تشریف لے جاتے، پھر کسی کو ان کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس دوران کوئی ملاقاتی بھی ان کی زیارت کے لیے نہیں آ سکتا تھا۔ بقول ڈاکٹر شاہزاد علوی بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضری کے بعد جب ان کے والد محترم کی واپسی ہوتی اور وہ اہلِ خانہ کو کمرے میں آنے کی اجازت دیتے تو اس وقت ان کا چہرہ باطنی خوشی اور نورانیت سے تمتما رہا ہوتا تھا۔ حضرت علوی صاحبؒ نے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں شب کے وقت اپنی حاضری کا راز راقم کو بھی بتایا تھا۔ بارگاہِ رسالت میں حضوری کے حوالے

سے وہ کبھی کوئی اہم راز فاش نہیں کرتے تھے،ہاں،جن باتوں کے اظہار کی اُنہیں اجازت ہوتی تھی، ان کا ذکر فرما دیتے تھے۔ان کے بقول جب انہیں حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں حاضری نصیب ہوتی، وہ حضور ﷺ پر درود وسلام پڑھتے تو سرکار ﷺ سلام کا جواب ارشاد فرماتے۔بعض موقعوں پر حضور ﷺ فرماتے:''علوی، جاؤ پہلے علی کو مل لو''۔پھر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے، ان سے فیوض وبرکات اور ہدایات حاصل کرتے۔حضور ﷺ کی نسبت وہ عالمِ کیف وسرور میں فرماتے:''حضور ﷺ انتہائی رحیم ،کریم اور شفیق ہیں''۔ایک بار میری درخواست پر حضرت علوی صاحبؒ نے حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عاشقِ رسول ممتاز قادری کے حوالے سے ایک سوال پیش کیا تو سرکار ﷺ نے ارشاد فرمایا:''اس بارے میں تم خاموش رہو''۔مراد یہ تھی کہ مشیتِ الٰہی کے مطابق بعض باتیں اپنے وقت کے مطابق ظاہر ہوتی ہیں،قبل از وقت ان کا اظہار درست نہیں ہوتا۔بعض اوقات وہ دورانِ گفتگو اچانک فرماتے کہ اب احتیاط سے بات کریں کیونکہ اس وقت ہمیں سرکار ﷺ کی توجہات حاصل ہیں اور وہ ہماری گفتگو کو سماعت فرما رہے ہیں۔ایک بار راقم ان سے ملاقات کے لیے ان کے گھر واقع آکسفورڈ میں پہنچا ۔انہوں نے دورانِ گفتگو،منجملہ دیگر باتوں کے، ارشاد فرمایا:''ان دنوں حضرت امام حسین علیہ السلام کی ڈیوٹی افغانستان میں ہے،وہاں وہ مسلمان مجاہدین کے سپہ سالار ہیں''۔پوری دنیا نے چند برس پہلے دیکھا کہ اسلام دشمن امریکی حملہ آوروں کو ذلت آمیز شکست ہوئی اور وہ وہاں سے فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔

راقم کو اعلیٰ عدلیہ میں عاشق رسول ممتاز قادری کے دفاع میں پیش ہو کر بحث کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ممتاز قادری کو ایک موقع پر جاگتے ہوئے حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، سرکار ﷺ نے اُسے چند ہدایات دیں جو ممتاز قادری نے راز میں رکھیں۔اس نے یہ بات راقم اور اس کے ساتھی وکلا کو اڈیالہ جیل میں ملاقات کے دوران بتائی۔ممتاز قادری کے سکون،عزم واستقلال اور حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضری کے شوقِ فراواں سے مترشح ہوتا تھا کہ اسے شہادت کی بشارت مل چکی ہے۔اس کی ظاہری سزا پر عمل درآمد کے بعد راقم حضرت ساجد علوی صاحبؒ سے ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے ارشاد فرمایا''شہادت کے بعد جب ممتاز قادری بارگاہِ رسالت میں پہنچا تو میں وہاں موجود تھا،میں اس بات کا عینی گواہ ہوں کہ ممتاز قادری نے حضور نبی اکرم ﷺ پر درود وسلام پڑھا تو آپ ﷺ نے اسے اشارہ فرمایا کہ آگے آجاؤ۔وہ آگے بڑھا اور حضور ﷺ کے قریب پہنچ گیا۔سرکار ﷺ نے اسے اپنے سینہ مبارک سے لگایا،ماتھے پر بوسہ دیا،اپنی داہنی طرف بٹھایا اور رجال الغیب سے اس کا تعارف کرایا''۔راقم نے حضرت علوی صاحبؒ کی اس عینی شہادت کا ذکر ممتاز قادری کے بارے میں اپنی کتاب ''حاضری سے حضوری تک'' میں کیا ہے۔(بر صفحہ:۱۴۳)۔

حضرت ساجد علوی صاحبؒ درس وتدریس کے ماہر،علم وادب کے شائق اور ثنا خوانانِ مصطفیٰ ﷺ میں بلند مقام کے حامل تھے۔علاوہ ازیں وہ علمِ جفر میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔وہ اپنے احباب کے سوالات کے جوابات اور ان کی مشکلات کا حل علمِ جفر کی روشنی میں دیا کرتے تھے۔یوں وہ اپنا کافی وقت مخلوقِ خدا کی خدمت اور راہنمائی کرنے میں صرف فرماتے تھے۔

ہمارے ممدوح حضرت ساجد علوی صاحبؒ کے روحانی مرتبہ ومقام کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ہمیں تو اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ ایک صاحب مقام ولی اللہ تھے اور حُبِّ رسول ﷺ کی خوشبو سے مُشکبار اور عشقِ رسول کے انوار سے منور تھے۔وہ ایسے اولیائے کرام میں شامل تھے جن کے بارے میں حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا ہے:

یک زمانہ صحبتے با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگِ خارہ و مرمر شوی
چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی
صحبتِ صالح تُرا صالح کند
صحبتِ طالح تُرا طالح کند

ترجمہ:اللہ کے ولی کی صحبت میں گزارا ہوا کچھ وقت سو سال کی بے ریا عبادت سے بھی بہتر ہے۔اگر تو سخت پتھر اور سنگِ مرمر ہے تو کسی صاحبِ دل کی صحبت سے تو موتی بن جاتا ہے۔(ایسے ہی) نیک افراد کی صحبت تجھے نیک،اور بُروں کی صحبت تجھے بُرا بنا دیتی ہے۔

ہمارے ممدوح حضرت ساجد علویؒ بھی اُن کامل اولیائے کرام میں شامل تھے جن کی صحبت سے فیض یاب ہو کر بندہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اُسے گویا برسوں کی طاعتِ بے ریا نصیب ہوئی ہے۔ان کی صحبت میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب پاک ﷺ کی یاد دل میں تازہ ہوتی،فاسد خیالات دور ہوتے اور تادیر نعت کی صورت میں ذکرِ مصطفیٰ ﷺ کی سعادت نصیب ہوتی۔الحمدللہ!راقم کو حضرت ساجد علویؒ کی خدمت میں بارہا حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ان ملاقاتوں کے فیوض وبرکات اور روحانی مسرت کی

خوش گوار یادیں راقم کی زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

حضرت ساجد علویؒ عظیم عاشق رسول تھے۔انہیں عشق کی سند بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے عطا ہوئی اور حضور ﷺ کی نظرِ کرم سے وہ بارگاہِ رسالت میں حضوری پانے والے درویش بن گئے۔ان کے عشقِ رسول کا اظہار ان کے نعتیہ کلام میں جابجا ہوتا ہے جن میں ''نورو سرور''، ''اُن کی یاد اُن کا خیال''، ''محرابِ جاں''، ''جانِ جہاں''، ''شوقِ فراواں''، ''ذوقِ جمال''، ''رباعیاتِ ساجد علویؒ'' شامل ہیں۔ان کا کلام محض ایک فن آشنا، قادرالکلام، شاعر کی تخیلاتی طبع آزمائی نہیں بلکہ ایک صاحبِ نظر، صاحبِ حال، صاحبِ مشاہدہ اور عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے درویش کا کلام ہے۔نعت کی زبان کے حوالے سے حضرت ساجد علویؒ کا ارشاد ہے: ''نعت کا ہر لفظ اپنے مجاز و معنی کے لحاظ سے لطیف اور اپنی صورت کے اعتبار سے سرتاپا رعنائی ہوتا ہے۔نعت کی اپنی زبان ہوتی ہے۔زبان کا ہر لفظ نعت کے قابل نہیں ہوتا۔نعت میں لفظی تطہیر کا اہتمام پیشِ نظر ہوتا ہے۔اس صنفِ سخن میں صرف لطیف و جمیل الفاظ حرمِ شعر میں بار پاتے ہیں۔ادب و تعظیم کا رویہ نعت کی جان ہوتا ہے۔۔۔'' (پیش لفظ بعنوان ''للہ الحمد'' مشمولہ کتاب ''ذوقِ جمال''، ص ۷۔از ساجد علویؒ)۔اپنی ایک نعت میں انہوں نے ارشاد فرمایا:۔

شائستہ و شُستہ ہو زباں نعت کی ساجد
میرے لبِ گفتار پہ رحمت کی نظر ہو
(نورو سرور: ص ۵۲)

حضرت ساجد علویؒ اپنی دلکش دنیائے نعت میں خوش مست و سرشار رہے۔اُن کے لبِ گفتار پہ رحمۃ للعالمین کی نظرِ کرم رہی۔ان کا سارا نعتیہ کلام زبان کی شائستگی، شُستگی، لفظی تطہیر اور لطیف و جمیل خیالات کا حسین مرقع ہے۔ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ایک قاری کی روح اور دنیائے دل عشقِ نبی ﷺ کی خوشبو سے مُشکبار ہو جاتی ہے اور اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ لاریب شاعر محض قیل و قال اور فنی کمال کا اظہار نہیں کر رہا بلکہ کئی باطنی اسرار کھول رہا ہے۔وہ فرماتے ہیں:۔

نبیؐ کی نعت میں ساجد مگن ہے شام و سحر
ہے خوش نصیب یہ نغمہ سرا محبت کا
(نورو سرور: ص ۵۶)

لطفِ نبیؐ سے ذرّہ ضیا بار ہو گیا
سویا ہوا نصیب تھا بیدار ہو گیا
(ایضاً: ص ۵۸)

ساجد میرا دل رہتا ہے مسرور ہمیشہ
ہے ورد مزا مدحتِ محبوبؐ دو عالم
(ایضاً: ۸۶)

وہ اپنے حوالے سے حضور نبی اکرم ﷺ کی نظرِ کرم کا ذکر یوں فرماتے ہیں:۔

جب سے رسولِ حق کی نظر مہربان ہے
مجھ پر جہانِ شمس و قمر مہربان ہے
(ایضاً: ص ۶۳)

ذکرِ حضورؐ شام و سحر وِرد ہے مرا
چشمِ حضورؐ شام و سحر مہربان ہے
(ایضاً: ص ۶۳)

بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حضوری کی نعمت سے سرفراز ہو کر وہ فرماتے ہیں:۔

دل میں ساجد کچھ نہیں جز حیرت و وارفتگی
جان ہے سرشار روئے والضحیٰ کو دیکھ کر
(شوقِ فراواں: ص ۹۰)

تم پہلی نظر میں ہوئے آئینہ حیرت
اس چہرے سے ہوں گے ابھی انوار عیاں اور
(نورو سرور: ص ۱۴۸)

سراسر ہے یہ فیضانِ زیارت
شبانہ روز ساجد شادماں ہے
(ایضاً: ص ۱۴۷)

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بفیضِ چشمِ کرم
نہ گھر سے نکلے مگر بارگاہ تک پہنچے
(ایضاً: ص ۱۴۸)

آخری شعر میں انہوں نے اغماض سے کام لیتے ہوئے اپنا ذکر نہیں کیا لیکن مراد یہی ہے کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنہیں سوئے طیبہ سفر کیے بغیر بھی بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حضوری نصیب ہو گئی۔

حضرت ساجد علویؒ کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان حضور نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام بھیجنے کو اپنا وظیفہ بنائیں اور اپنے گھروں میں محافلِ میلاد کا اہتمام کریں۔اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں:۔

بھیجئے اُن کو درودوں کے تحائف ہر روز
عید ہر روز شہِؐ دیں کے کرم سے ہوگی
(شوقِ فراواں: ص ۱۴۳)

روزِ محشر اُس کو ساجد کوئی اندیشہ نہیں
ہے درودِ پاک جس کے دفترِ اعمال میں
(ایضاً: ص: ۱۲۸)

درود جس کا وظیفہ مدام ہو جائے
نبیؐ سے اُس کا سلام و پیام ہو جائے
(ایضاً: ص ۱۶۵)

فکرِ ساجد پہ برستا ہے عطا کا بادل
ہاتھ میں جب وہ پئے نعت قلم لیتا ہے
(ایضاً: ص ۱۶۰)

نبیؐ کی راہ پہ چلتا رہوں سدا ساجدؔ
الٰہی! عمر مری گزرے نعت خوانی میں
(ایضاً: ص ۲۳۸)

مبارک ہو اسے دونوں جہاں کی نعمتِ عظمیٰ
جسے دیدار حاصل ہو گیا حضرت محمدؐ کا
(ایضاً: ص ۶۰)

آج گھر میں ہے جمی محفلِ میلادِ نبیؐ
آج پھر لگتا ہے جنت کی طرح گھر اپنا
(ایضاً: ص ۵۷)

اپنی ایک نعت میں انہوں نے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ انہیں نبی پاک ﷺ کے فیض سے حق کا سُراغ ملا، مرقد میں بھی حضور ﷺ کی یاد ان کے ساتھ رہے گی، وہ حضور ﷺ کی نعتوں کی برکت سے خوش وخرم رہے اور ہر رنج والم سے فراغت پا کر دنیا سے جا رہے ہیں۔ یہ مفاہیم ان کے مندرجہ ذیل اشعار میں ملتے ہیں:۔

ہم اُن کی بزم سے حق کا سُراغ لے کے چلے
نبیؐ کے فیض کا روشن چراغ لے کے چلے
نبیؐ کی یاد رہے گی جلیس مرقد میں
اسی نشاط کا ہم ساتھ ایاغ لے کے چلے
بفیضِ نعت رہے شاد کام ہم ساجد
تمام رنج والم سے فراغ لے کے چلے
(ذوقِ جمال: ص ۱۰۳)

نعتِ نبیؐ ایک مسلّمہ ادبی، دینی اور روحانی صنف ہے جس میں ذکرِ مصطفیٰ ﷺ، شانِ مصطفیٰ ﷺ اور سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کا بیان ہوتا ہے۔ یہ ایسا اظہاریہ ہے جس میں بارگاہِ رسالت مآب ﷺ کی عظمت اور ادب واحترام کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ یہ محض کمالِ فن کا نہیں بلکہ کمالِ ادب واحترام اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا اظہار ہے۔ حضور ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں رفعتِ صوت بھی ادب کے منافی ہے۔ ادب کے تقاضوں میں ایک یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے حضور صاف اور سچی بات کہی جائے۔ نعت شریف میں کسی حقیقت کو ایک حد تک مبالغے کے انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں کذب بیانی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر کسی مسلمان کو خواب میں حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہو تو وہ نعت کے شعر میں اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر وہ دیدارِ مصطفیٰ ﷺ کی آرزو اور التجا کر سکتا ہے۔ ہمیں حضرت ساجد علویؒ کے نعتیہ کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے حق سچ کا اظہار ہی ملتا ہے۔ ایک بار انہیں درِ رسول ﷺ میں حاضری کا پروانہ عطا ہوا تو انہوں نے فرمایا:۔

دل کی حسرت مٹ گئی ارمان پورا ہو گیا
نام میرے اُن کی جانب سے پیام آ ہی گیا
رات دن ساجد نظر میں اب بہارِ خُلد ہے
شاہؐ کے دربارِ اقدس میں غلام آ ہی گیا
(نور وسرور: ص ۱۲۲)

دنیاوی مناصب کے علاوہ بلند روحانی مقامات کے حامل ہونے کے باوجود حضرت ساجد علویؒ میں احساسِ تفاخر نام کو نہیں تھا۔ عاجزی اور انکساری ان کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ وہ گفتگو بڑے نرم لہجے میں فرماتے۔ وہ موجودہ دور کے کچھ غلط کار اور جعلی پیروں کی طرح اپنی بے جا تعظیم وتکریم نہیں کرواتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان کی دست بوسی کی کوشش کرتا تو اسے روک کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتے۔ یہی انداز میرے مرشد پاک حضرت سیّد رجب علی شاہ رحمہ اللہ کا تھا۔ دست بوسی جائز ہونے کے باوجود، صاحبانِ تقویٰ اس سے بچتے تھے تا کہ قلب میں تکبّر کی تخم ریزی نہ ہو۔ عاجزی وانکساری کے رنگ میں جینے والوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر میں ہوتا ہے:۔

زمیں کی طرح جس نے عاجزی وخاکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانکا آسماں ہو کر

دنیا سے رخصتی کے وقت عام لوگ سکراتِ موت سے گزرتے ہیں اور بولنے کی سکت بھی نہیں رکھتے۔ خوش قسمت مسلمانوں کو آخری وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا نصیب ہوتا ہے۔ ہمارے ممدوح حضرت ساجد علویؒ آخری وقت بھی مطمئن اور خوش وخرم تھے۔ انہوں نے اپنے اہلِ خانہ کے سامنے اپنے صاحبزادے ڈاکٹر شاہزاد علوی کو پاس بُلا کر یہ الفاظ فرمائے: "انہوں نے مجھے مدینہ بلا لیا ہے، مجھے پھوپھی جی، والد صاحب اور دادا جان لینے آ رہے ہیں"۔ پھر انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کا ہاتھ تھام کر خدا حافظ کہتے ہوئے فرمایا: "اب تم اکیلی ہو جاؤ گی جو پڑھائی کرو گی مجھے بھیجا کرنا"۔ آخری لمحات میں حضرت ساجد علویؒ نے کلمہ طیبہ پڑھا اور آیت الکرسی پڑھتے پڑھتے بڑے سکون سے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ یہی سکون واطمینان بعد از وصال ان کے روئے مبارک سے ظاہر ہوتا تھا۔ ان کی آرزو تھی:۔

مریضِ دردِ محبت ہوں لے چلو بطحا
ہوا وہیں کی مجھے سازگار آئے گی
(نور وسرور: ص ۱۱۵)

ایسا لگتا ہے کہ دمِ آخر ان کی اس آرزو کو پذیرائی نصیب ہوئی اور وہ بزبانِ حال یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے:

صلہ حُبِّ نبیؐ کا اس طرح سے پا رہا ہوں میں
دمِ آخر مدینہ کی طرف اب جا رہا ہوں میں
(راقم)

ادب کیا ہے؟ (ادب پارہ تخلیقی تجربے کا اظہار و ابلاغ)

ڈاکٹر محمد خاں اشرف/لاہور

تخلیقی تجربہ تخیل کے راستے اور زبان کے ذریعے سے فنکارانہ اظہار پا لیتا ہے تو ادب پارہ وجود میں آتا ہے۔ادب پارہ تخلیقی عمل کا مقصود و منتہٰی اور نقطۂ عروج ہے ۔ زبان اور معاشرے میں 'ادب پاروں' کے مجموعے کو ہی 'ادب' کہا جاتا ہے۔ادب پارہ تخلیقی عمل کی تخم پذیری کا شیریں اور فرحت بخش ثمر ہے جو معاشرے میں افراد کو متاثر کرتا ہے اور جمالیاتی مسرت دیتا ہے، عام قاری اسی کے ذریعے سے ادب اور ادیب سے شناسائی حاصل کرتے ہیں۔ادب پارہ ہی معاشرے میں افراد اور طلبا کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ اور بنیاد ہے ۔اسی سے قوم مجموعی طور پر اپنی اجتماعی اور انفرادی قدروں اور معیاروں کا شعور و عرفان حاصل کرتی ہے۔علما، حکما، مؤرخ اور نقادان کے مطالعے اور تجزیے کو اپنا موضوع بناتے ہیں،ادب اپنے معاشرے کی اخلاقی ،روحانی اور علمی کیفیت و حالت کا ، تاریخ سے کہیں زیادہ اور بہتر ترجمان اور علمبردار ہوتا ہے کہ یہ فرد کے ذریعے اس کے شعور اور شخصیت کے ذریعے ، زیادہ سچائی اور درستی سے ان قدروں کا ابلاغ کرتا ہے۔

گذشتہ ابواب میں ہم نے تخلیقی عمل کے ان داخلی عوامل کا جائزہ لیا تھا جو ادب کی تخلیق میں کردار ادا کرتے ہیں اور ادب کے مظہر کے اجزائے ترکیبی کا وہ حصہ ہیں جو قارئین کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں لیکن ادب کا بنیادی جزو ہیں کہ ان کے بغیر ادب نہ وجود میں آتا ہے اور نہ ہی اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ادیب کے باطن میں وجود پاتے ہیں۔ان میں تخلیقی تجربہ، اس کا ادیب و شاعر کے وجود میں وارد ہونا ، اس کا ادیب کے تخیل میں محفوظ ہونا ، پھر زبان کے راستے اس کا خارجی اظہار ہونا شامل ہیں ۔ اسی مطالعے کا ایک حصہ اس محرک کا جائزہ لینا بھی ہے جو اس تخلیقی تجربے کی تحریک کا باعث ہوتا ہے۔

یہ تخلیقی تجربہ جب خارجی اظہار پا لیتا ہے اور زبان میں اپنا وجود قائم کر لیتا ہے تو ''ادب پارہ'' وجود میں آتا ہے۔اس کی تخلیق ادیب کی ذات اور شخصیت میں ہوتی ہے لیکن اظہار پا کر وہ ''آزاد'' وجود حاصل کر لیتا ہے ۔ وہ اپنے خالق کی شخصیت ، اس کے ماحول،اس کی زبان و بیان کی روایات و خصوصیات کا مظہر ہوتا ہے اور ان سب کا اس میں نشان و سراغ ملتا ہے لیکن ادیب کے تخلیقی تجربے کی انفرادیت کا ادیب کا علم وفن کا شعور اور ادیب کی شخصیت کی کوکھ میں جنم پا کر اس میں ایسی انفرادی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے سے پہلے کے تمام ادبی موجودات سے الگ اور جدا ہوتا ہے ۔ اپنی اس انفرادیت میں اپنا علیحدہ تشخص قائم کرتا ہے اور اس طرح زبان و ادبیات کی دنیا میں وہ ایک الگ شخصیت، علیحدہ وجود اور جداگانہ انفرادیت کا حاصل ہوتا ہے، یہ انفرادیت اس کی زبان اور اسلوب کے باعث بھی ہو سکتی ہے، اس کے منفرد موضوع اور اس کو پیش کرنے کے نقطۂ نظر کے باعث بھی ، اس میں اس کی جداگانہ ساخت اور کرافٹ کا عمل بھی ہو سکتا ہے اور یہ سب مل کر بھی اس کو دوسروں سے مختلف بنا سکتے ہیں۔گو کچھ عرصہ تک اس کی شناخت اور تفہیم و تشریح کے حوالوں میں اس کے خالق کا ذکر آتا ہے لیکن اگر حقیقی و فنی معنوں میں وہ مکمل ہے تو آخر کار وہ اپنا علیحدہ وجود قائم کرتا ہے۔اس طرح وہ ایک شخص، ایک عہد اور ایک وقت سے متعلق اور منسلک ہونے کے باوجود ہر عہد، ہر دور اور ہر شخص کے لیے اپنا وجود اور شناخت قائم کرتا ہے اور اس میں ادب کی آفاقی اور دائمی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں ۔ بیسویں صدی کے نصف میں امریکہ میں ''نئی تنقید'' کے حامیوں نے بھی ادب پاروں کی اپنی خود مختاری کا نظریہ پیش کیا تھا کہ ہر ادب پارے کا مطالعہ اور اس کی اپنی ذات ہی کے حوالے سے کیا جانا چاہیے۔(Ransom, The New Criticism, 1941)

کسی بھی زبان و ادب میں ان ادب پاروں کے مجموعے کو ''ادب'' کا نام دیا گیا ہے۔اس میں نظم اور نثر کی تمام تخلیقی تحریریں شامل ہوتی ہیں ۔ ادب و شاعری تحریر میں نہ بھی ہو تو وہ ادب اور شاعری ہے۔ لوک گیت ، داستانیں ، تمثیلیں ، ڈرامے ، فوک لور، ماہیے اور گائی اور سنائی جانے والی دیگر اصناف اس کا حصہ ہیں جو معاشرے اور زبان میں اپنا ''وجود'' اور مقام رکھتے ہیں لیکن جب ادب پارہ تحریر میں آ جاتا ہے تو وہ محفوظ اور دائم ہو جاتا ہے۔تحریر ابلاغ کا وہ حصہ ہے جو ادب پاروں کو ایک مستقل ، منفرد اور پائیدار دوام بخشتا ہے ۔ زبانی اور غیر تحریری صورت میں ادب میں تصرفات و تحریفات ہوتی رہتی ہیں لیکن تحریری صورت میں آنے کے بعد وہ قائم بالذات ہو جاتے ہیں۔

ادبی تاریخ میں ادب پاروں کو نقادوں، مفکرین، علما اور قارئین نے ہمیشہ بحث اور مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ ادب پاروں کو تخلیق کاروں اور زمانے کے لحاظ سے ترتیب دے کر اس سے اس کے ادوار کے بارے میں بیش قیمت معلومات اور حقائق دریافت کیے ہیں۔ ادب پارے معاشرے میں گفتگو اور گرمیِ محفل ہی نہیں علمی اور فکری مطالعات کا ایک مستقل موضوع بن چکے ہیں۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں ادب کی مخصوص اہمیت رہی ہے اور ان کی ضرورت، اہمیت، جواز اور اثرات کے بارے میں مفکرین اور علما نے اپنے خیالات قلم بند کیے ہیں۔ نقادوں نے ان کی فنی و لسانی خصوصیات، ان کی تعمیر و ساخت، ان میں زبان کے استعمال، اس کے رجحانات اور معاشرے اور افراد پر اس کی اہمیت اور ضرورت یا عدم ضرورت پر رائے زنی کی ہے۔ جہاں تک قارئین اور معاشرے کا تعلق ہے ان کے مختلف طبقات نے اس کے بارے میں ہمیشہ ردِ عمل دیا، اسے لطف اندوز ہوئے اور اس سے بصیرت حاصل کی۔ کچھ افراد نے ادب کو معاشرے میں اخلاق و آداب کی ترویج کے لیے استعمال کیا، کچھ نے ادب و شاعری کو اخلاق پر برے اثرات کا باعث ٹھہرایا، حکمرانوں نے اس کو بسا اوقات اپنی اہمیت اور قوت کا ایک ذریعہ بنانا چاہا، سیاست دانوں نے اس کو اپنے نظریات کے فروغ اور ترویج کے لیے استعمال کرنا چاہا۔ ادب کی یہی ہمہ گیر اثر پذیری ہے کہ کسی بھی دور میں نہ اس کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جا سکا اور نہ ہی ختم کیا جا سکا۔ معاشرے کے مختلف طبقات نے مختلف ادوار میں اس کو اپنے اغراض و مقاصد کا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں اس کو ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ انسانی تاریخ کے وہی ادوار تہذیب و تمدن کے اعلیٰ ترین عہد قرار پائے جب ادب اور دیگر تخلیقی فنون کو معاشرے میں مرکزی اہمیت اور وقار حاصل رہا۔ اور جن ادوار میں ان کو نظر انداز یا نیست و نابود کرنے کی کوشش کی گئی وہ انسانی تاریخ کے تاریک ترین ادوار ثابت ہوئے، ادب بہترین انسانی تہذیبی و تمدنی اقدار کے اظہار، فروغ اور اثبات کا حامل ہوتا ہے۔

ادب پارہ کیا ہے؟ یہ ادیب و شاعر کے اس تخلیقی تجربے کی خارجی تجسیم ہے جس سے وہ گزرا یا اس پر منکشف یا وارد ہوا اور اس نے تخیل کے راستے اور زبان کے ذریعے سے اس کا اظہار و ابلاغ کیا، ادب پارہ اظہار کے بعد اپنا جداگانہ 'وجود' حاصل کر لیتا ہے، گو وہ اپنے خالق کی تخلیق ہے لیکن زبان میں مقید ہو جانے کے بعد وہ اپنا علیحدہ تشخص قائم کر لیتا ہے۔ وہ اب اپنے خالق کا پابند نہیں رہتا، بلکہ معاشرے میں اپنی جوہری معنویت، انفرادیت، آفاقیت، اپنی وجودی خوبصورتی، جمال، اثر پذیری اور انسانی تعلق داری کے باعث زندہ رہتا ہے۔

'ادب پارہ' ایک وسیع اصطلاح ہے، اس سے مراد ادب کی وہ تمام صورتیں ہیں جو کسی بھی زبان میں رائج ہوں، ان کو ''اصناف'' کہا جاتا ہے۔ اصناف ہر زبان اور ہر معاشرے کے اپنے تاریخی اور عمرانی تقاضوں کے پیشِ نظر اظہار و ابلاغ کی وہ صورتیں ہیں جو ادب اختیار کرتا ہے اور وہ اس کی ادبی روایت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ زبان اور معاشرتی تقاضوں کے پیشِ نظر ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ارتقا جاری رہتا ہے۔ کچھ اصناف زندہ رہتی ہیں کچھ صورت بدلتی ہیں اور کچھ متروک اور فنا ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ سانچے اور خارجی صورتیں ہیں جو تخلیقی تجربہ اظہار کے عمل میں اختیار کرتا ہے، تخلیقی ادیب نئی اصناف بھی تخلیق کر سکتے ہیں اور قدیم کو بھی اپنی تقاضوں اور ضرورت کے مطابق نئی صورتوں میں ڈھال سکتے ہیں۔

ادب کی دو بڑی صورتیں ہیں جو تقریباً ہر زبان اور ادب میں پائی جاتی ہیں، ایک نظم اور دوسری نثر۔ نظم بنیادی طور پر 'کلامِ موزوں' کا نام ہے یعنی ایسا کلام جس میں 'وزن' پایا جائے اور عموماً تاریخی طور پر یہ شعری ابلاغ کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے، اس کو گانا اور یاد رکھنا آسان ہے۔ دوسرے ''نثر'' یعنی ایسی عبارت یا کلام جو وزن نہ رکھتا ہو، یعنی عام بول چال کے قریب کی زبان۔ نظم اور نثر میں مزید ''اصناف'' پائی جاتی ہیں جو ہر زبان کی مخصوص تاریخ، معاشرت، پس منظر، ماحول اور دیگر خصوصیات کے زیر اثر وجود میں آتی ہیں، 'اصناف' ادبی تجربے کے اظہار و ابلاغ کے وہ سانچے ہیں جو کسی زبان میں روایتاً رائج ہوتے ہیں۔ اصناف کا مطالعہ ایک علیحدہ موضوع کا متقاضی ہے جو فی الحال ہمارے دائرے سے باہر ہے کہ ہم اس وقت ادب کے مظہر سے بحیثیت مجموعی بحث کر رہے ہیں۔

ہر ادب پارے کا مطالعہ تین پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجودی ساخت، اس کا موضوع، اور اس کی زبان، یہ تینوں پہلو ادب پارے کے نامیاتی وجود کے جز و لاینفک ہیں۔ عظیم ادب پاروں میں یہ تینوں پہلو اس طور پر ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں کہ ان کو مطلق جدا نہیں کیا جا سکتا لیکن مطالعے کی

سہولت کے لیے ادب کے نقاد اور مؤرخ اس طریق کا سہارا لیتے ہیں۔

ادیب تخلیقی عمل میں آزاد ہے کہ وہ جو موضوع بھی چاہے اختیار کرے، دراصل موضوع، زبان اور خارجی ساخت (یا صنف) وہ اجزا ہیں جو اس کے تخلیقی تجربے کو خارجی شکل دینے میں مدد دیتے ہیں۔ ادیبوں پر اکثر مختلف معاشرتی رجحانات کے مطابق مختلف پابندیاں لگانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ حقیقت نگاری کریں، یا معاشرتی وسماجی مسائل کی طرف توجہ دیں یا رومانوی زبان و اندازِ بیان اختیار کریں یا کسی مخصوص نظریہ یا اخلاقی وسیاسی موضوع کو اپنائیں، یہ سب لاحاصل ہیں۔ ادیب وشاعر ایسی کسی بھی خارجی پابندی سے مبرا اور آزاد ہیں چاہے وہ حقیقت نگاری کریں یا خیالی ورومانوی دنیا آباد کریں، عالمِ خاک وباد میں رہیں یا عالمِ لاہوت کی سیر کریں، ماضی کے دھندلکوں میں چلے جائیں یا مستقبل کی صورت پذیری کریں۔ یہ سب ان کا تخلیقی استحقاق ہے۔ ادب کا موضوع دنیا اور جو کچھ اس میں ہے سے بھی وسیع تر ہے کہ وہ حقیقت کو بیان کرے یا امکانات وتصورات کو قلم بند کرے یا اپنی جدا دنیا تخلیق کرے۔ تخلیق کرنے کا مطلب ہی عدم سے وجود میں لانا ہے۔ ہاں البتہ وہ جو بھی کرے اس کو ادیب وشاعر کے تخلیقی شعور اور وحدتِ تخیل کا پابند ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ادب پارہ جو خود ایک ''وحدت'' ہے اپنا ''وحدتِ وجود'' قائم رکھے۔

مطالعہ کا دوسرا پہلو تخلیقی زبان ہے۔ زبان ایک موجود حقیقت ہے، زبان ماضی سے آتی ہے اور معاشرے میں اس کے بیان، اظہار، معانی کے سانچے متعین ہیں، اس کی قواعد، صرف ونحو، بیان و بدیع، فصاحت، بلاغت کے معیار اور طریقے ماضی ہی سے متعین ہوتے ہیں۔ زبان، معاشرے میں اظہار و ابلاغ کا ذریعہ ہے جو اس کے حال کو ماضی سے اور فرد کو معاشرے سے پیوستہ رکھتا ہے اور جو مختلف علوم و فنون میں ایک رشتہ قائم رکھتا ہے۔ بلکہ خود ہی وہ رشتہ بنے تا کہ معاشرے میں افراد میں ان کو سمجھا جا سکے۔ ادیب وشاعر کی آزمائش وامتحان یہ ہے کہ وہ اس پرانی اور قدیم زبان کو اپنے نئے، انوکھے اور تازہ تجربے کے بیان اور اظہار وابلاغ کے لیے اس طرح استعمال کرتا ہے کہ استعجاب، مسرت، بصیرت کے ساتھ نئی حقیقتوں اور تصورات وامکانات کو وجود میں لاتا ہے۔ یہی اس کے جوہر کی انفرادیت اور نابغیت کا امتحان ہے۔ ادیب وشاعر زبان سے پیوست رہتے ہوئے اپنی نابغیت سے کام لیتے ہوئے ماضی وحال کے تمام بندھن عبور کرتے ہوئے زبان میں اتنے امکانات پیدا کر لیتا ہے کہ وہ اسے اپنے منفرد تخلیقی تجربے کے اظہار وابلاغ کا ذریعہ بنا سکے۔ یہ اس کی شخصیت کے اس جوہر کا عمل ہے جو اس کے وجود میں وہبی اور اکتسابی صلاحیتوں اور علوم ولسان کو متحد کر دیتا ہے لہٰذا وہ پرانی اور روایتی زبان و بیان میں نئی تراکیب، تشبیہات، استعارے اور بیان کے دوسرے ذرائع پیدا کرتا ہے۔ کم تر اہلیت وصلاحیت کے حامل ادیب زبان و بیان کے قدیم ذرائع پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور کہی ہوئی باتوں کو دہراتے ہیں لیکن تخلیقی فنکار ان میں نیا پن بھر دیتا ہے اور زبان کے امکانات کو ظاہر کر کے اس کی حدود میں وسعت اور بیان میں فراخی پیدا کرتا ہے۔

جہاں تک ادب پارے کی 'ساخت' کا تعلق ہے اس کی بنیاد ''وحدت'' کا تصور ہے۔ ''وحدت'' کے تصور کے بغیر ''وجود'' کا تصور ممکن نہیں ہے۔ ادب پارہ ایک علیحدہ وجود ہے اور ہر ''وجود'' اس لیے ''وجود'' ہے کہ وہ ایک ''وحدت'' کا حامل ہے۔ یعنی اس کی ذات کا ایک آغاز ہے، درمیان ہے اور ایک انتہا، وحدت کا یہ تصور انسان کی فطرت اور تخلیق میں اس طرح مضمر ہے کہ وہ اس کا وہبی شعور رکھتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اسی طرح دیکھتا، سوچتا اور سمجھتا ہے۔ ادب پارہ بھی ایک وجود ہے لہٰذا اس کی ایک ابتدا ہوتی ہے اور ایک انتہا، اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے وہ اس کا وجود ہے۔ ساخت کا یہ تصور ہمیں نقادوں کے ہاں ہمیشہ سے ملتا ہے گو اس کا اظہار بہت کم کیا گیا ہے۔ اس کا اولین باقاعدہ اظہار ہمیں اولین باقاعدہ نقاد ارسطو کے ہاں ملتا ہے جس نے اپنی کتاب ''Poetics'' فنِ شاعری (بوطیقا) میں المیہ شاعری سے بحث کرتے ہوئے کیا تھا۔

''المیہ ایک ایسے عمل کی نقل ہے کہ جو مکمل ہو اور وحدت رکھتا ہو۔۔۔ وحدت رکھنے کا مطلب ہے کہ اس میں آغاز ہو، درمیان ہو اور اختتام ہو۔'' (فنِ شاعری، باب 7)

یہ تعریف ہر ادب پارے پر صادق آ سکتی ہے۔ ادب پارہ مختصر ہو یا طویل، اس میں ''وحدت'' ہوگی تو وہ اپنا 'وجود' قائم رکھے گا۔ یعنی وہ ادب کی دنیا کا ایسا 'جزو' ہوگا جو ہر دور، ہر مقام اور ہر جگہ میں اپنا آپ قائم رکھ سکے گا۔

مغربی تہذیب کا معاشرتی انحطاط

پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن

ابتدائے آفرینش سے حضرت انسان تحفظ ذات کے گھمبیر مسائل سے دوچار ہے۔ کارزار حیات میں اس کا ہر قدم موت کی جانب پیش قدمی ہے۔ اگرچہ اس کا ہر فعل تحفظ ذات (Preservation of life) کی علامت ہے۔ خود کو قبر سے اوجھل رکھنا مقصد حیات ہے لیکن تا بکئے...... جبلی زندگی میں پہاڑوں کی اوٹ میں غاروں میں چھپنا۔ دریاؤں کے کنارے بسنا، جنگلوں میں شکار کرنا۔ پھر انفرادی سطح سے بلند ہو کر سماجی شعور کے ضوابط کی پاسداری کرنا، اس کے بعد ارتقائی منازل طے کر کے قومی تشخص اُجاگر کرنا۔ یہ سب مراحل لاشعوری تحفظ ذات کے تصورات ہیں۔ صدیوں کے سفر میں قوم جن روایات کے ساتھ زندہ رہتی ہے وہی اس کی تہذیب و ثقافت ہے۔ شناخت ہے اور سرمایہ افتخار بھی۔

فطرت کے اصول اٹل قوانین ہیں نہ توڑے جا سکتے ہیں نہ بدلے جا سکتے ہیں۔ فطرت ہماری آنکھوں سے اوجھل اپنا توازن ہر صورت برقرار رکھتی ہے۔ اس کا نظام جنمی ہے۔ کرہ ارض پر جب انسانی قوتیں فطری ضوابط سے تجاوز کرتی ہیں تو فطرت اپنا بیلنس قائم رکھنے کے لیے ہر رکاوٹ دور کر دیتی ہے۔ دولت، طاقت، تہذیب اور آرام و عیش کتنا ہی عروج پر پہنچ جائیں زندگی کی برق رفتاری اسے ''ثبات'' نہیں بخش سکتی۔ ظلم برداشت نہیں ہوتا۔ عدل کی کرن ماند نہیں پڑتی۔ طاقت کا سورج ڈوب جاتا ہے۔ دولت عیاش طبقے کو بالآخر تباہ کرتی ہے۔ قارون، فرعون اور ہامان جو دولت، طاقت اور مذہب کی موجودہ علامتیں ہیں۔ دیکھیں کب تک زندہ ہیں۔ قانون قدرت تو یہی ہے کہ ہر کمالے را زوالے Every rise has a fall دور حاضر مغربی تہذیب کا نغمہ سرا ہے۔ مشرق و مغرب میں اس کی پذیرائی ہے۔ اس تہذیب نے اپنی ارتقائی منازل بھی نہایت سرعت سے اور خوبصورت انداز سے طے کیے ہیں جس کے باعث اس کا دم خم بھی برقرار رہے...... لیکن آج کا جدید علمی تجزیاتی ذہن سے تہذیب کی کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ جو اس کے وجود کے لیے بھی مضر ہیں۔ اس کے اجزائے ترکیبی (خاندان، معاشرہ اور قوم) شیرازہ بندی کی بجائے خود انتشار کا شکار ہیں۔ حضرت علامہ کے الفاظ میں:

ع جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

زمانے کی ژروف نگاہی ہر عہد کے عروج و زوال کی داستان تاریخ کے صفحات میں ڈھونڈنے کی منتظر رہتی ہے۔ کسی معاشرے کے وجود میں خاندان ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ معاشرے کی شیرازہ بندی میں یہ ایک اہم ترین جزو ہے۔ جس طرح کہ ہر فرد خاندان میں اپنی اہمیت کا حامل ہے اس کی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بعینہٖ خاندان کو معاشرے میں ایک خاص فوقیت حاصل ہے۔ معاشرتی ارتقا کا تصور بھی افراد اور خاندان کی بہبود سے وابستہ ہے۔ یہی ارتقا کسی قوم کے تہذیب و تمدن کی علامت ہے۔ ہر قوم اپنے مخصوص معاشرے کی نمائندہ ہوتی ہے جو اسے زندگی کا دوام بخشتی ہے۔ اپنی تہذیب و ثقافت کی بدولت ہر عہد میں پہچان اور شناخت رکھتی ہے۔

ہر عہد میں زندگی کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ جو قوم ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی سکت نہیں رکھتی وہ کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے اور شکستگی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ معاشرتی وجود خطرے میں خاندان کی اکائی معدوم اور افراد کی سائیکی عدم تحفظ کے باعث یکسر بدل جاتی ہے۔ کیونکہ قانون فطرت ''جہد للبقا'' یا دوسرے الفاظ میں Survival of the fittest تبدیل نہیں ہوتا۔ جغرافیہ بدل جاتا ہے تاریخ کے اصول نہیں بدلتے۔ کیسی کیسی مضبوط حکومتیں، شاہی سلطنتیں اور جابر قومیں صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔ اب ان کے نام تاریخ میں نشانِ عبرت کے سوا کچھ نہیں۔ کسی کا خون اعلیٰ ہے نہ نسل ارفع۔ قانون قدرت سب کے لیے یکساں۔

ہر قوم شعوری اور لاشعوری طور پر اپنی تہذیب و ثقافت کے احیاء کے لیے مقدور بھر کوشش کرتی ہے۔ اپنی نمائندہ اوصاف کے باعث پذیرائی حاصل کرتی ہے۔ دیگر اقوام کی نوجوان نسل ان خوبیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ہر قوم کی نوجوان نسل اپنے آباء کی نسبت زیادہ کشادہ ذہن ہوتی ہے (ان کی یہ خوبی ان کے علم اور تجربات کی دین ہے) مغربی تہذیب کی پذیرائی میں جہاں بے شمار عوامل کا دخل ہے وہاں پر ''شخصی آزادی'' کا عنصر بہت اہم ہے۔ آزادی کا سانس لینا انسان کی گھٹی میں شامل ہے (بلاشبہ مذاہب خصوصاً اسلام میں ہر فرد کو آزاد اور ذمہ دار قرار دیا گیا ہے) پذیرائی کی دوسری وجہ ''جبری تسلط'' ہے جس کے باعث ہر مفتوح قوم زیر نگیں رہ کر اپنے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرتی ہے۔ ریاست اور حکومت کے لیے کسی خاص قوم کا تشخص ضروری نہیں۔ ایک ریاست میں کئی قومیں اور کئی ریاستوں میں ایک قوم کا تصور موجود ہے۔ مگر ہر ریاست میں ایک حکومت ضروری ہے جو اپنے ہر شہری کے جان و مال کے تحفظ کی پابند ہوتی ہے۔ تحفظ کا احساس آپ کی آزادی کا ضامن ہے۔ جو حکومتیں اپنا یہ فرض نبھاتی ہیں وہاں پر ہر فرد سکھ کا سانس لیتا ہے۔ وہ ریاستیں Welfare States کہلاتی ہیں۔ وہاں ہر فورم پر آپ اپنے

حقوق کی جنگ لڑ سکتے ہیں۔حکومت آپ کو اسباب و اختیار کے ساتھ آپ کا ساتھ دیتی ہے۔تاکہ آپ کو احساس محرومی نہ ہو۔وطن عزیز سے مغربی ممالک میں جا بسنے والے Brain Drain کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

مغربی تہذیب کے ارتقائی مدارج میں اب آئے دن کئی اہم عناصر کے معدوم ہونے کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔قوم کے اجتماعی شعور کا تاریخی تجزیاتی مطالعہ شاہد ہے کہ قوم کے ترکیبی عناصر کی زنجیر کی ہر کڑی اہمیت کی حامل ہے۔فرد، خاندان، معاشرہ کے عوامل میں سے ایک عنصر بھی کمزور پڑ جائے پوری قوم متاثر ہو جاتی ہے۔ریاست اور حکومت کی حدود اور دائرہ کار جداگانہ ہے۔شخصی آزادی دورِ حاضر کا طرۂ امتیاز ہے۔ ریاست اس کی تائید کرتی ہے اور حکومت اس کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔

المیہ یہ ہے کہ شخصی آزادی کا پہلا شکار خاندان کا وجود بنتا ہے۔نفسیاتی طور پر خاندان کی شکستگی افراد کو احساس تحفظ سے محروم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ لاشعوری طور پر افراد اپنے حقوق کے لیے ریاست سے براہ راست منسلک ہو جاتے ہیں اور حکومت سے رابطہ کرنے میں حق بجانب ہوتے ہیں۔یوں ریاست کا وجود اور حکومت کا استحکام ان کے لیے زیادہ معتبر ہو جاتا ہے۔ افراد معاشرے کا وجود بننے کی بجائے ریاست کا حصہ بنتے ہیں۔ وفاداری ریاست اور حکومت سے ہو جاتی ہے۔ اس طرح خاندان اور معاشرے معدوم ہو جاتے ہیں۔ ریاست بھی اپنے افراد کے لیے ہر ممکن بنیادی سہولیات فراہم کرتی ہے۔بنیادی ضروریات منظم اور احسن طریق سے پورا کرتی ہے۔یہ اس کی ذمہ داری تصور ہوتا ہے۔

مغرب میں خاندان کا تصور قصہ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔معاشرتی زندگی کے کینوس پر خاندان کی تصویر نمایاں نظر نہیں آتی۔فرد خاندان سے ٹوٹ چکا ہے۔ اگرچہ مشرق میں بھی خاندان کا تصور بری طرح زوال کی زد میں ہے۔ بلکہ نزع کے عالم میں ہے مگر ابھی سانس باقی ہے۔اب خاندان کے بڑے بزرجمہر بھی خاندان کی بقا کے لیے افراد کی شخصی آزادی قربان نہیں کرتے۔ہر فرد End in Itself ہے۔خاندان کے بعد معاشرہ بھی افراد کو احساس تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتا۔معاشرتی اعلیٰ اقدار کا کوئی قانونی استحقاق نہیں۔ وہ حتمی قوانین کا جواز نہیں رکھتیں۔ اخلاقی اقدار صرف Hypothetical ہوتی ہیں۔ ہرگز Categorical نہیں ہوتیں۔ بزرگوں کی عزت کرنا چاہیے۔اگر یہ اخلاقی قدر ہے۔اگر کوئی نہیں کرتا آپ اسے سزا نہیں دے سکتے۔ یہ قانونی جرم نہیں۔ اس فطری احساس نے فرد کو خاندان اور معاشرے کے جال سے نکال کر ریاست سے وابستہ کر دیا ہے۔اب ان کی اخلاقیات ملکی قوانین کی پابندی سے مشروط ہے۔ذاتی سوچ، مذہب، عقیدہ، نسل اور پیشہ فرد کے بنیادی حقوق کی پاسداری میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ قوانین کی پاسداری با اخلاق کردار کا سٹیفکیٹ ہے۔ مغربی اقوام نے طویل تباہ کن جنگوں کے اثرات سے بھرپور طریق سے یہ سبق سیکھ لیا ہے کہ سکون کی تلاش انسان کا فطری خاصہ ہے۔یہ نفسیاتی اور جبلی اُمنگ کسی قانونی ضوابط کی پابندی نہیں۔ کسی منطقی جواز کو تسلیم نہیں کرتی۔ یہ فرد کا انفرادی استحقاق بھی ہے جو خاندان اور معاشرے کے معدوم ہونے کی صورت میں بری طرح تنہائی کا شکار ہے۔اس تنہائی کے خلا کو پورا کرنے اور احساس محرومی کے مداوا کے لیے ''فلاحی ریاست'' کے تصور کو بھرپور طریق سے اُجاگر کیا ہے۔ فرد کو تنہا نہیں چھوڑا بلکہ اس کی ذاتی صلاحیتوں کی بھی حفاظت کی ہے۔اس کے ذاتی معاملات میں کم سے کم مداخلت کے باوجود اس کی بنیادی ضروریات کو بدرجہ اتم ذمہ داری سے پورا کیا ہے۔عوام کی فلاح کے لیے ایسے قوانین وضع کیے جاتے ہیں کہ وہ فکر فردا کے نفسیاتی اور معاشی دباؤ (Pressure) کے تحت آ کر حکومت کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھا سکیں۔یوں افراد کو خاندان اور معاشرے کی گرفت میں رہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ بلکہ اس سے آزادی کے ثمرات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی اٹل ہے کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار خلا میں جنم نہیں لیتیں۔ یہ معاشرتی عمل سے جنم لیتی ہیں۔ تہذیبی روایات سے پروان چڑھتی ہیں۔ثقافت انہیں دوام بخشتی ہے۔طاقت کے قوانین تو اس کا گلا گھونٹ سکتے ہیں۔ انہیں زندگی نہیں بخش سکتے۔ اس لیے خاندان اور معاشرے کے وجود کے بغیر ریاست اور حکومت کے قوانین یہ احساسات مروت پیدا نہیں کر سکتے۔افراد فرائض ادا کر سکتے ہیں۔ذمہ داری نبھا سکتے مگر عقیدت، احترام، ادب، محبت اور اعلیٰ اقدار کا تصور دل میں نہیں بٹھا سکتے۔اگرچہ فلاحی ریاست نے بچوں کے لیے Broken family homes, child protection homes اور بوڑھوں کے لیے Old age homes وغیرہ کے ذریعے افراد کی محرومیوں کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر کیا یہ ''انسانیت'' کے تمام مقاصد پر پورا اُترتے ہیں؟

ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر فرد کو ''انسان'' کے مقام سے گرا کر اس کی ''انسانیت'' سے محروم کرتے ہیں۔ یہ معاشرتی انحطاط ''انسانیت'' کا تہذیبی المیہ ہے جو مغرب میں عروج پر ہے۔ جدید دور کا انسان اس ''تذلیل'' کو کب تک برداشت کرتا ہے۔ یہ سوالیہ نشان ہے؟

✦✦✦

ابرار ندیم کی کالم نگاری

اصغر ندیم سیّد

اردو مزاح نگاری میں عطاء الحق قاسمی کی منفرد روایت نصف صدی سے تر و تازہ ہے اور اس شاندار روایت سے فیض پانے والوں میں ابرار ندیم سرفہرست ہیں۔ وہ کالم بھی لکھتے ہیں اور مضامین کا اپنا اسلوب رکھتے ہیں۔ ان کے طنز و مزاح میں زمانے کی ریاکاریاں، دوہرے معیاز اور معاشرتی کج روی کو کھل کے نشانہ بنانے کا رویہ ابرار ندیم کے ہاں ان کی اپنی پہچان بھی بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کا بنیادی رجحان مزاح نگاری میں ہے لیکن طنز کو وہ اسی مزاح کی طاقت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کالم کبھی کبھی ایک کردار کے وسیلے سے پورے سماج کو بے نقاب کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ کردار دراصل علامتی ہوتے ہیں جو ہمارے سماج کی صدیوں پرانی روایت کی نمائندگی کرتے ہوئے انسانوں کے ان رویوں کو ظاہر کرتے ہیں جو وقت کے ساتھ راسخ ہو چکے ہوتے ہیں۔ ابرار ندیم کے فن میں ایک افسانہ نگار بھی موجود ہے۔ وہ چاہے تو کسی بھی وقت اُس افسانہ نگار سے کام لے سکتا ہے۔ سب سے اہم بات اُس کی رچاؤ اور اس سے بھری نثر ہے۔ جو عطا الحق قاسمی کے بعد مجھے بہت کم یاب دکھائی دیتی ہے۔ ابرار ندیم صحیح معنوں میں تہذیبی تجربے میں گندھی نثر کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ مجھے ابرار ندیم ایک شریر کالم نگار اور ایک چلبلے مزاح نگار کے ذریعے گدگدی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ البتہ وہ خنجر سے گدگدی کرنے کی بجائے صرف قلم سے گدگدی پیدا کرنے کا کام کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں عطا الحق قاسمی نے ابرار ندیم سے بہت شفقت اور محبت کی ہے اور اُس نے بھی ان سے فیض پانے کا سلیقہ نبھایا ہے۔ یہ روایت بہت پھلے پھولے گی۔ بہت سے کام نگار اس راہ پر چلے مگر انہیں بے برکتی نے مار دیا۔ ابرار ندیم کے ہاں برکتوں کی بہار ہے۔ وہ جو جملہ لکھتا ہے وہ زندگی سے مالا مال ہوتا ہے۔

اُس کی نثر یا کالم پڑھنا شروع کریں تو ختم کیے بغیر اُسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ یہ ہنر ہی کافی ہے کسی کو لکھنے کے جواز کے لیے۔ ابرار ندیم میں مزاح کے فطری پہلو موجود ہیں۔ اُسے بس دل سے سوچنا پڑتا ہے اور اُس کا کام بن جاتا ہے۔ میں بہت سے نئے مزاح نگاروں سے مایوس ہوا ہوں۔ جب جب مایوسی ہوتی ہے مجھے ابرار ندیم کا خیال آتا ہے اور میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ عطا الحق قاسمی کی روایت میں ایک جاندار اور زندہ دل موجود ہے۔ ابرار ندیم سے جو اُمید باندھی تھی پوری ہوئی ہے۔

✦✦✦

غزلیں / عامر بن علی، جاپان

تم سے شکوہ نہ زمانے سے شکایت کی ہے
ہم ہی مجرم ہیں کہ اس دور میں چاہت کی ہے
لوگ ناداں ہیں جو پھر شور اُٹھا دیتے ہیں
شیخ نے تو سدا مسند کی حمایت کی ہے
عشق والوں نے کبھی ظلم پہ بیعت نہیں کی
ہم نے ہر دور کے جابر سے بغاوت کی ہے
رزم گاہوں میں کٹا کرتی ہے شاہوں کی حیات
حُسن والوں نے اداؤں سے حکومت کی ہے
چاہتیں اور بھی گزری ہیں زمانے میں مگر
جیسے ہم کرتے ہیں کب کس نے محبت کی ہے

شبِ فراق میں پُردرد خواب دیکھا ہے
کہ اپنے پیار کا دریا سراب دیکھا ہے
تمہاری آنکھ میں دیکھی ہے موتیوں کی لڑی
تمہارے چہرے کو بکھرا گلاب دیکھا ہے
برستی آگ ہے، چاروں طرف ہے آہ و فغاں
تمہارے بعد جو شہرِ خراب دیکھا ہے
طویل غم، شبِ تنہائی اور تاریکی
کتابِ زیست کا جو انتساب دیکھا ہے
صبا کے دوش پہ خوشبو کا پیرہن اوڑھے
گزرتی تتلیوں پر بھی عذاب دیکھا ہے
شفق کے چہرے پہ بکھرے ہوئے ہیں ہجر کے داغ
ہر ایک رُت کا پریشاں شباب دیکھا ہے

مشاعرے کی روایت اور ماہنامہ ''شاعر'' آگرہ کا مشاعرہ نمبر (۱۹۵۰ء)

خاور اعجاز

مشاعرے کی روایت اور مشاعرہ ماضی کا ایک تہذیبی مشغلہ تھا اور آج بھی ہے۔ اِس کی اہمیت و افادیت گذشتہ ادوار میں بھی تھی اور اَب بھی اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اِس روایت میں اگر کوئی تبدیلی ہُوئی ہے تو اِس قدر کہ اَب مشاعروں میں شمع گردش نہیں کرتی بلکہ مائیک کے گرد شاعر گردش کرتے ہیں۔ زمینی نشستیں آج بھی ہوتی ہیں لیکن اَب شعرا کرسیوں پر براجمان ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لباس مشرقی عمامہ، اچکن اور شیروانی سے زیادہ سوٹ بوٹ میں مبدل ہو گیا ہے۔ دربار میں شاعری پیش کرنے کا رواج دَم توڑ چکا لیکن درباری شاعر اور درباری شعرا نے دَم نہیں توڑا۔ بالائی ایوانوں میں کبھی کبھار محافلِ مشاعرہ کا اہتمام اِس امر کی تصدیق کرتا ہے جس میں بقائے شعر سے زیادہ بقائے شاعر مقصود ہوتی ہے۔

مشاعرے کی داغ بیل ایران میں پڑی جسے عرب کی قبائلی زندگی میں اپنے قبیلے کی روایات کے پرچار کی ترقی یافتہ صورت کہا جا سکتا ہے۔ عرب کی آزاد قبائلی شعری روایت نے ایران میں جاگیردارانہ اور شاہی نظام کے زیرِ سایہ پرورش پائی۔ ہندوستان میں بھی ایرانی روایت نے گولکنڈہ، بیجاپور اور دہلی کے درباروں کے توسط سے قبولیت پائی جس پر فارسی کے گہرے اثرات تھے۔ شعرأ کے پہلو بہ پہلو امرأ و وزرأ حتیٰ کہ خود بادشاہ بھی شرکت کرنے لگے جن میں نوابینِ رامپور، آصف الدولہ اور بہادر شاہ ظفر بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ ظاہر ہے ایسے مشاعروں میں تہذیب و اخلاق، تقدیم و تاخیر کے معاملات اور نشست و برخاست کے طور طریقوں کو ملحوظ رکھنا ایک پابندی تھی جو مشاعرے کی روایت کا حصہ بن گئی۔

پھر رفتہ رفتہ ریختہ کہنے والوں نے اپنے اجتماعات کو مراختہ سے ممیّز کرنا شروع کیا اور اِن کا اہتمام درباروں کی بجائے شعرأ کی رہائش گاہوں پر ہونے لگا اور شعر و شاعری کے ساتھ تواضع اور مہمان نوازی کے مقابلے بھی ہونے لگے۔ اساتذہ کے گروہوں میں مقابلے کی اِس صورتِ حال نے جہاں رقابت و شکر رنجی کی فضا پیدا کی وہاں زبان و ادب کے معیاروں کو بلند تر کرنے میں بھی معاونت کی تاہم طرحی مشاعروں نے محض قافیہ پیمائی کو بھی فروغ دیا۔ اِس پس منظر میں انجمن پنجاب لاہور نے ارتعاش پیدا کیا لیکن اِس کی لہریں جلد ہی آغوشِ ساحل میں چلی گئیں۔ آگے چل کر مشاعروں کی بد انتظامی، تقدیم و تاخیر کے ساتھ پڑھنے پر اعتراضات، مبتدیوں کی کمزور اور بعض اوقات اسقام کی حامل منظومات اور مشاعروں کی طوالت کے علاوہ پابندیٔ اوقات سے انحراف نے اِس روایت کو خاصا نقصان پہنچایا تاہم جیسے تیسے یہ روایت اپنی مجلسی، لسانی اور ادبی اہمیت کے پیشِ نظر مفقود ہو جانے سے محفوظ رہی۔

ادبی رسائل کے اجرا نے شعرأ کی بہ نفسِ نفیس شرکت کو قلمی شرکت میں بدل کر ایک نیا پلیٹ فارم مہیا کیا جس نے مشاعرے میں داد و تحسین یا تنقید کی ترسیل کو قدرے مؤخر تو کیا لیکن ایک متبادل نظامِ شراکت ضرور بہم پہنچایا۔ اِن میں شائع ہونے والی منظومات نے مشاعرے کے جزوی نعم البدل کا کردار ادا کیا۔ یہی روایت تھوڑا آگے چل کے جرائد کے مخصوص نمبروں (غزل نمبر، نظم نمبر وغیرہ) کی شکل میں ایک وسیع تر پلیٹ فارم ثابت ہُوئی۔ اِس سلسلے میں ایک اختراعی کام ماہنامہ ''شاعر''، آگرہ کے مدیر اعجاز صدیقی کے ہاتھوں انجام پایا جنھوں نے مکتبہ قصر الادب، آگرہ کے تحت ۱۹۵۰ء میں مذکورہ مجلّہ کا ''مشاعرہ نمبر'' شائع کر کے ادبی دُنیا میں ایک نئی راہ نکالی۔ ۱۹۳۰ء میں اِس پرچہ کی ادارت اُن کے والد جناب سیمابؔ اکبر آبادی کے پاس تھی جسے اُنھوں نے ۱۹۳۵ء میں اپنے بیٹے اعجاز حسین صدیقی کے سپرد کر دیا۔ اعجاز صدیقی ۱۹۱۱ء میں آگرہ شہر میں پیدا ہُوئے۔ اُن کی نظموں کے دو مجموعے ''خوابوں کے مسیحا'' اور ''کربِ خود کلامی'' ۱۹۶۶ء میں منصۂ شہود پر آئے اور ایک مجموعۂ غزل ''درونِ سخن'' اُن کی وفات کے بہت بعد ۲۰۱۴ء میں شائع ہُوا۔ اُن کی غزلوں کی زبان جدید اور مواد کلاسیکی ہے لہٰذا کہیں رومانویت اور کہیں فکری انفرادیت دکھائی دیتی ہے۔

یوں تو ماہنامہ ''شاعر'' کی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۷۸ء پر محیط اڑھائی سو سے اوپر اشاعتیں (بشمول آگرہ نمبر ۱۹۳۶ء، افسانہ نمبر ۱۹۵۴ء، ڈراما نمبر ۱۹۶۴ء، کرشن چندر نمبر ۱۹۶۷ء، غالب نمبر ۱۹۶۹ء) ایک طویل مقالہ کی متقاضی ہیں لیکن اِس نشست میں اِس مجلّہ کے ''مشاعرہ نمبر'' کا مختصر جائزہ لیا جائے گا۔ مذکورہ نمبر ایک مصرعِ طرح ''اِنھیں اندھیروں سے بزمِ گیتی کو ایک دن روشنی مِلے گی'' پر مدیر سمیت ایک سو اکیس شعرأ کی ہم طرح غزلوں پر مشتمل ہے جن کے اسمائے گرامی بلحاظِ حروفِ تہجی درجِ ذیل ہیں (بریکٹ میں ترتیبِ اشاعت ہے):

آرزو لکھنوی (۲)، آوارہ مظفر پوری (۹۴)، اثر لکھنوی (۳)، اختر سورتی (۱۱۲)، ادیب مالیگانوی (۲۴)، ارمان دہلوی (۹۹)، اسعد مبارکپوری (۱۰۰)، اسلم اثر قراولی (۷۹)، اطہر مالیگانوی (۱۰۶)، اعجاز صدیقی (۱۲۱)، اقبال نرگس (۱۷ب)، اکرم حنفی دھولیوی (۶۳)، الم مظفر نگری (۲۰)، انور صابری (۲۸)، ایوب رائے پوری (۸۱)، بسمل صدیقی لکھنوی (۴۴)، بہزاد لکھنوی (۱۸)، پاگل مبارکپوری (۸۴)، پریم دہلوی (۶۴)، تلوک چند محروم (۱۰)، تمنا بجنوری (۴۰)، تمنا یوسفی (۱۰۲)، جگن ناتھ آزاد (۲۲)، جلیل عرشی (۷۰)، جمال قریشی احمد آبادی (۹۶)، جمنا داس اختر (۳۲)، جوش ملسیانی (۸)، حاجی نبی احمد بریلوی (۶۰)، حامدی کاشمیری (۱۰۳)، حزیں قریشی احمد آبادی (۶۲)، حمید آذر ناگپوری (۴۱)، خاور شاہدوی (۱۷)، خلش دردی بڑودوی (۶۶)، خلیق ایولوی (۷۶)، خورشید ایلچپوری (۸۹)، دعا ڈبائیوی (۵۸)، دلشاد کلانچوی (۷۳)، ذابر فتحپوری (۴۸)، راغب مراد آبادی (۳۶)، رضی صدیقی جالونی (۱۰۱)، رفیق انور فاروقی (۱۱۷)، روش صدیقی (۱۴)، رونق دکنی (۵۰)، زاہد سوتھروی (۳۸)، ساز بلگرامی (۵۴)، ساغر اجمیری (۶۹)، ساغر انصاری بنارسی (۸۵)، ساغر نظامی (۱۳)، سالک حنفی نذر آبادی (۹۱)، سحر برامد پوری (۶۷)، سراج لکھنوی (۹)، سریر کابری گیاوی (۱۲)، سلطان نقشبندی ایولوی (۱۰۹)، سندر شیام پرویز (۵۵)، سیف بھسالوی (۴۶)، سیماب اکبر آبادی (۱)، شارق جمال (۹۷)، شفا گوالیاری (۴۹)، شفق صدیقی جونپوری (۱۹)، شفیق کوٹی (۳۹)، شمس قریشی شاہجہانپوری (۹۲)، شمیم کرہانی (۲۳)، شو پرشاد برگ باندوی (۱۱۹)، شہ زور کاشمیری (۶۱)، صہبا رسول پوری (۱۱۸)، ضیا فتح آبادی (۲۱)، ضیا میرٹھی (۹۸)، ضیا ہانی بھیمڑوی (۷۷)، طرفہ قریشی (۳۰)، ظفر اعظمی (۵۶)، ظہیر چشتی نظامی بلہاری (۱۰۷)، عارف بانکوٹی (۹۰)، عبدالکریم ثمر (۴۲)، عرش ملسیانی (۲۶)، عزیز اختر (۵۷)، نفرحت کمالی بلہاروی (۶۸)، فنا حیدر آبادی (۹۵)، فیض نظام پوری (۹۳)، قاسم شبیر نقوی (۵۹)، قمر بھسالوی (۵۳)، قمر جلال آبادی (۴۷)، قمر نعمانی (۲۷)، قیس کوٹوی (۱۰۵)، کامل جہلمی (۱۱۶)، کلیم شاہدوی (۱۱۵)، کوثر بلہاروی (۱۱۳)، کوکب القادری (۵۱)، گوپال متل (۳۳)، لطفی بھیمڑوی (۸۲)، مانی جائسی (۶)، ماہر القادری (۱۵)، مجاز اکبر آبادی (۵۲)، مخزون نیازی (۴۳)، محشر دہلوی (۷۵)، محمود مظفر پوری (۱۲۰)، محوی لکھنوی (۷)، مختار ادیبی مالیگانوی (۸۸)، مشہود مفتی (۳۷)، مضطر ککوڑوی (۳۴)، مفتوں کوٹوی (۸۷)، منظر صدیقی (۱۷)، منور لکھنوی (۲۹)، مہر وردلوی (۱۱۱)، میکش اکبر آبادی (۱۱)، ناسق فاروقی ناگپوری (۸۶)، نثار اٹاوی (۲۵)، نریش کمار شاد (۱۶)، نسیم رائے پوری (۴۵)، نشتر ہتگامی (۳۵)، نصرت کرلوی (۱۱۴)، نظر افغانی (۸۳)، نظر سیہوری (۳۱)، نعمان تاثیر (۷۲) نواب جھانسوی (۴۷)، نوح ناروی (۵)، نیر جالندھری (۱۰۴)، نیر سیمابی جہلمی (۶۵)، نیر کھممی (۷۸)، وارث القادری (۱۰۸)، واقف برہانپوری (۸۰)، وحشت کلکتوی (۴)، وفا براہی (۳۷) اور ہربنس سنگھ اختر (۱۱۰)

یہ فہرست دیکھنے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہاں پاگل مبارکپوری، خلش دردی بڑودی، سیف بھساولی، لطفی بھیمڑوی، مضطر ککوڑوی، نصرت کرلوی اور نیر کھممی جیسے شعرا کو شاملِ اشاعت کیا گیا وہاں حسرت موہانی، یاس یگانہ چنگیزی، بیخود دہلوی، بزم آفندی، برجموہن کیفی دہلوی، جگر بسوانی، دل شاہجہانپوری، اطہر ہاپوڑی، تاجور نجیب آبادی، اشک رامپوری، فراق گورکھپوری، صوفی تبسم اور آنند نرائن ملا جیسے بیسیوں نام کیوں نظرانداز کر دیے گئے جو پرچہ کی اشاعت کے وقت بقیدِ حیات تھے۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ ان میں سے بعض شعرا کو بوجوہ شرکت کی دعوت ہی نہ دی گئی ہو اور دُوسری وجہ یہ ممکن ہے کہ بعض اصحاب نے خود شرکت سے گریز کیا ہو اور اپنی پیرانہ سالی یا دیگر مصروفیات کی بنا پر شریک نہ ہو سکے ہوں بہرحال اِس فقرۂ معترضہ کے بعد ہم پرچہ کے مندرجات کی طرف لوٹتے ہیں۔

علاقائی نمائندگی کی حد تک شعرا کی شمولیت کسی قدر متوازن کہی جا سکتی ہے جس میں اٹاوہ، اجمیر، احمد آباد، اکبر آباد، باندہ، بجنور، برہانپور، بریلی، بڑودہ، بلگرام، ، بنارس، جالندھر، جائس، جلال آباد، جونپور، جہلم، جھانسی، حیدرآباد، دکن، دہلی، رائے پور، رسول پور، سورت، شاہجہانپور، فتح آباد، فتح پور، کرہان، کلکتہ، گوالیار، گیا، لکھنو، مالیگاؤں، مبارکپور، مراد آباد، مظفر پور، مظفر نگر، ملسیان، میرٹھ، نارہ، ناگپور، نظام پور اور ہتگام وغیرہ کے شعرا شریک ہیں۔ اِن میں لکھنوی کے بعد دہلوی اور اکبر آبادی شعرا کا پلہ بھاری نظر آتا ہے اور الہ آباد، امرتسر، امروہہ، انبالہ، بدایوں، بہرائچ، ٹونک، جونا گڑھ، جے پور، رامپور، سہسواں، سیالکوٹ، عظیم آباد، کان پور، گورکھ پور، لاہور، مارہرہ اور نجیب آباد

وغیرہ کے خانے بالکل خالی ہے۔

زیرِ نظر شمارہ میں شامل قریباً سوا سو طرحی غزلیں شامل ہیں جن کا انفرادی مطالعہ نہ صرف ہمارے لیے کارِ دارد ہوگا بلکہ قارئین کے لیے بھی دوبھر ثابت ہو گا۔ اِس مشکل کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ بعض اساتذہ کی غزلوں کی قرأت کے بعد دیگر شعرا کے منتخب اشعار پر نظر ڈال لی جائے۔

پہلی طرحی غزل جناب سیمابؔ اکبر آبادی کی ہے جو گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ سید عاشق حسین سیمابؔ اکبر آبادی (۱۸۸۰۔ ۱۹۵۱) کہنے کو تو داغؔ کے شاگرد تھے مگر خود بھی ایسے جیّد اُستاد ہُوئے کہ غیر منقسم ہندوستان میں اُن کے تلامذہ کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اُستادانہ رنگ کی کلاسیکی غزل میں بعض مقامات پر جدید خیالات کے حامل ٹکڑے اُن کی مشاقی، پُرگوئی اور خوشنمائی ظاہر کرتے ہیں۔ اُنھوں نے روایت کی روشنی میں سفر کیا لیکن راستے میں اپنے تجربوں کی شمعیں بھی جلاتے چلے گئے۔ قدیم رنگِ سخن سے یعنی محض عورت، اُس کے متعلقات اور امرد پرستی وغیرہ سے احتراز کرتے ہُوئے فلسفہ، حقائق، عصری رجحانات اور دیگر انسانی مسائل کی طرف توجہ دی۔ قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ سنجیدہ اور متین مضامین، معنی آفرینی کے ساتھ باندھے۔ سیمابؔ کے ہاں بتدریج عصری مسائل کی طرف توجہ، حیات و کائنات کے معاملات پر تبصرہ و تنقید، زندگی کے مسائل کی تفسیر اور انسان کے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ لانے کا رویّہ اُن کے مطالعہ اور مشاہدہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ شاعری کو عصری تقاضوں کی ترجمانی پر مامور رکھنے کی کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیمابؔ کی غزل میں رومانیت، تصوف، عشقِ حقیقی اور حیات و کائنات کی کرشمہ سازیوں کا ذکر ایک ساتھ ملتا ہے۔ اُن کی غزل اُن کی محنت کے نتیجے میں زبان کے اعلیٰ معیاروں کو چھوتی ہے اور فلسفیانہ حقائق و معارف کو متعارف کراتی ہے۔ سیمابؔ وسیع تجربہ اور نگاہِ دُور رس کے مالک تھے۔ اُنھوں نے گذشتہ دَور کے قدرے جامد شعری ڈھانچوں کو نئے زمانے کے متحرک پیمانوں میں ڈھالا۔ وہ اُن معدودے چند اہم شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے پورے انہماک اور بغیر کسی توقع کے اُردو شعر و ادب کی خدمت کی۔ اُن کی درج ذیل طرحی غزل میں آپ کو اُن کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا عکس ضرور نظر آئے گا:

فسردگی کی تہوں میں باقی حرارتِ زندگی ملے گی
نگاہ نے دُور تک کریدا تو آگ دل میں دبی ملے گی
بہت منظّم ہے بزمِ عالم، یہاں مساوات ہی ملے گی
جو شام تک روشنی ملی ہے تو صبح تک تیرگی ملے گی
جو تجھ کو منزل پہ ہے پہنچنا تو چل مرے نقشِ رہروی پر
مَیں جس فضا سے گذر چکا ہُوں فضا تجھے بھی وہی ملے گی
حیاتِ تازہ پہ مرنے والے حیاتِ تازہ ہے موت ہی سی
یہ زندگی پہلے ختم کر لے تو پھر نئی زندگی ملے گی
نہ بھول اے تارکِ محبت کہ ترکِ الفت بھی اِک خلش ہے
جو پھانس تُو نے نکال دی ہے وہ پھانس دل میں لگی ملے گی
جگار تاروں کی تیرگی میں، فشار ذروں کی روشنی میں
الٰہی اِس حشرِ زندگی میں کسی کو تسکین بھی ملے گی
سکون کہتی ہے جس کو دُنیا، سکوت میں ہے نہ گفتگو میں
کلی کہ ہے اِک سکوتِ مطلق، سکوں سے دامن تہی ملے گی
سجودِ آدم کی عظمتوں پر کرے گا جب غور نفسِ خود سر
تو آدمیت کی رفعتوں پر حقیقتِ آدمی ملے گی
ذرا سی خاطر شکستگی کی نہیں ہے برداشت آدمی کو
کلی کو وقتِ شکست دیکھو تو مسکراتی ہُوئی ملے گی
سکوں سے مایوس ہو نہ راہی، حیات ہے راہِ ابتدائی
ابھی تو منزل ہے دُور تیری، ملے گی تسکین بھی ملے گی
کہاں ہے سیمابؔ کا وہ دل اب جو اُس کے پہلو میں جستجو کی
گھٹا ہُوا سا دھواں ہے گا اُڑی ہُوئی خاک سی ملے گی

دُوسری غزل جناب آرزوؔ لکھنوی کی ہے جس میں نو اشعار موجود ہیں۔ سید انور حسین آرزوؔ لکھنوی (۱۸۷۲۔۱۹۵۱) نے معاشی سختیوں کے زمانے میں کلکتہ کے تھیٹر میں ڈرامہ اور گیت نگاری کی پھر بمبئی میں فلمی سرگرمیاں اختیار کیں۔ کہیں کہیں سپاٹ ہو جانے کے باوجود کلام عام فہم اور حلاوت سے پُر ہے۔ اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے قریبی سینئر معاصرین صفیؔ و ثاقبؔ وغیرہ کے احیائے غزل کے مشن کو آگے بڑھایا۔ ہموار اور یکرنگ غزل کہی۔ محاورہ اور زبان کو ہم آہنگ کر کے دلی کیفیات کی ترجمانی کی۔ فنِ عروض کے ماہر تھے۔ اِس فن کے رموز و نکات سے واقفیت نے بعض ایسی بحروں میں غزلیں کہلوائیں جو موسیقیت سے عاری اور محض مشقِ سخن کا حصہ نظر آتی ہیں۔ آرزوؔ کی غزل میں کوئی گہرائی نہ ہونے کے باوجود اُن کی انفرادیت فارسی کی بجائے ہندی اثرات کا پھیلاؤ ہے۔ یہی انداز اُن کی اِس طرحی غزل میں بھی نظر آتا ہے:

وہ آپ آئیں گے وقتِ آخر اجازتِ دید بھی ملے گی
کسے خبر تھی کہ موت ہی میں حلاوتِ زندگی ملے گی
تلاش کی حد تو ختم کر دے حصولِ مقصد کی فکر کیا ہے
جہاں قدم لڑکھڑائے تھک کر وہیں یہ دولت پڑی ملے گی
ظہور و غیبت ہیں ایک دونوں کمالِ جذبِ دلی کے آگے
نظر سے اوجھل ہُوا جو سورج تو چاند کی روشنی ملے گی
رہِ وفا میں فنائے ہستی بقائے دائم کی ہے ضمانت
یہ زندگی جب مٹا چکیں گے پھر اِک نئی زندگی ملے گی
کمر کو کس لے تُو منتظر بن کہ ہوگی جس دَم طلب اچانک
نہ وقفہ اِک سانس کا رہے گا نہ فرصت اِک بات کی ملے گی

سنبھل کے رہ، ہے جو رندِ مشرب حواس کھوئے تو کھو دیا سب
نہ ہوگا لطفِ خودی ہی حاصل نہ لذتِ بے خودی ملے گی
جفائے تازہ سے کم نہیں ہے مگر پشیمانیِ جفا بھی
جھکی نگاہیں اگر اُٹھیں بھی تو آنکھ جھینپی ہُوئی ملے گی
جو آنکھیں ہیں محوِ حسن کثرت بنیں گی کیا دیدبانِ وحسرت
جہاں بجھیں گی یہ جلتی شمعیں وہیں سے اِک روشنی ملے گی
کٹھن محبت کی منزلیں ہیں اور آگے بڑھنا ہے بے سہارے
جب آرزو آپ مٹ چکیں گے تو آرزوئے دلی ملے گی

تیسری غزل جناب اثر لکھنوی کی ہے۔ اِس میں گیارہ اشعار ہیں۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی (۱۸۸۵۔۱۹۶۷) جس زمانے میں اثر نے شاعری شروع کی وہ داغ و امیر کی شاعری سے گونج رہا تھا اور فکری ندرت کے اوّلین مراحل میں تھا پُر گو اور مشاق شاعر ہونے کے حوالے سے تو اثر اساتذہ کی فہرست میں داخل ہیں لیکن جس فکری استغراق کی ضرورت اُس عہد کی غزل کو ہو چلی تھی وہ مفقود ہے۔ اِس کمی کو اثر کی نیم شوخ لیکن مذاقِ سلیم کے عین مطابق کہی گئی غزل نے پورا کیا۔ لکھنوی کی خشک غزل کے مقابل اثر کے ہاں کیف و نشاط اور شادابی کے آثار نظر آتے ہیں جس کے باعث وہ لکھنوی تہذیب میں نئی روایت کے علمبردار کہے جا سکتے ہیں۔ یہ روایت زبان و بیان کے قدیم سانچے میں صحت مند تبدیلیوں اور اضافوں سے عبارت ہے جس کو فروغ دینے میں اثر لکھنوی کا بھی حصہ ہے۔ اُنھوں نے اپنے سائنٹفک جمالیاتی طرزِ تنقید سے بھی اِس مشن کو آگے بڑھانے میں کردار ادا کیا جس کا اظہار اُن کے تحریری تنقیدی سرمائے میں بھی ملتا ہے۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے ''نا سخیت'' کے طعنوں کو بھی بڑی خندہ پیشانی سے سہا۔ اُستادانہ غزل کہتے تھے۔ لکھنو کے محاورات اور روزمرہ پر عبور حاصل تھا۔ یہ خصوصیات آپ کو اُن کی زیرِ نظر طرحی غزل میں بھی دکھائی دیں گی:

جہاں ہے ظلمت کا دور دورہ یہ وہم ہے روشنی ملے گی
فضائیں نکھری ہُوئی ملیں گی، نظر کو بالیدگی ملے گی
عزیز جب ہو گا باغباں کو چمن کا ہر گل ہر آشیانہ
عروس جیسے ہو ایک شب کی بہار ایسی سجی ملے گی
ضمیرِ شب سے طلوع ہو گا اِک آفتابِ نظامِ تازہ
نئی نویلی سحر کی کرنوں سے کھیلتی زندگی ملے گی
جہاں ہُوئی ہے زمیں شفق گوں بہا ہے انساں کا خون اِتنا
بہم اخوت کا ہو جو پیماں تو بانہیں کھولے خوشی ملے گی
کہے نہ جاؤ یہ ہو کے نومید حاصلِ جہد کچھ نہیں ہے
خلوصِ نیت سے کام ہو گا تو داد دشمن کو بھی ملے گی
بجائے حبِ وطن ہے باہم چلن بغاوت کہ دشمنی کا
یہی جو پایانِ حریت ہے تو خاک آسودگی ملے گی
بُنے ہیں نفرت نے جال کیا کیا فریب و مکر و دغا و شر کے
یہ جن کے گُن ہیں یہ اُن کے دعوے کہ جلد ہی شانتی ملے گی
جو نیکیاں ہیں شکست خوردہ تو سرنگوں راستی کا پرچم
یہی جو نقشہ ہے آدمیت کفن میں لپٹی ہُوئی ملے گی
یہی جو ہے دُند خواہشوں کا یہی جو ہے گندگی کی پوجا
مہذب انساں کی وحشیوں سے کڑی کڑی سے جُڑی ملے گی
یہ کالی کالی ڈرانی راتیں مہیب خوابوں سے جو بسی ہیں
یہی ہیں وہ مرحلے کہ جن سے گذرنے پر زندگی ملے گی
جدید تہذیب کیا بلا ہے جو پوچھتے ہو اثر تو سُن لو
ہوس کے حلقے میں نیم عریاں بہیمیت ناچتی ملے گی

اگلی غزل کے خالق وحشت کلکتوی ہیں۔ یہ غزل سات اشعار کی ہے۔ سید رضا علی خاں وحشت کلکتوی (۱۸۸۱۔۱۹۵۶) کے کلام میں آہنگ وصوت کی خوبصورت آمیزش ملتی ہے جس نے اُن کی غزلیہ شاعری میں غنائیت کی لہر دوڑا کر شعر کے مفہوم میں جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست بھی متاثر کن ہے۔ وہ اِس اہتمام سے الفاظ کا مصرعوں میں پروتے ہیں کہ شعر کی فصاحت و بلاغت دو چند ہو جاتی ہے۔ اِس عمل میں اُنھوں نے رعایتِ لفظی سے برمحل کام لیا ہے۔ اُن کے شاعرانہ عشق و محبت میں بھی اُن کی عملی زندگی کا ادب و احترام پایا جاتا ہے جو ایک خاص طرح کی متانت اور رواداری کی عکاسی کرتا ہے اور وحشت کی بالغ نظری کا قائل بناتا ہے۔ اُن کی معاملہ بندی بھی فلسفہ و حکمت سے خالی نہیں۔ حقیقت کے متلاشی شخص کے ہاں اگر قوتِ مشاہدہ کی کمی واقع ہو جائے تو فلسفہ و حکمت کی عمارت دھڑام سے نیچے آ رہتی ہے لیکن وحشت کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہُوئے ہمیں کسی ایسے احساس سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ اُن کے شوقِ مشاہدہ نے ہر مقام پر اُن کا ساتھ دیا ہے اور وہ مہملات کا شکار ہونے سے بچ گئے ہیں۔

اُنھوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اُن کی شاعری کی دُنیا محدود ہے اور اِس محدود دُنیا کی حدیں نیازِ عشق، نازِ حسن، جمالِ یار، کج ادائیِ محبوب اور اُمیدِ وصال جیسے داخلی موضوعات سے متعین ہو رہی ہیں اور اُن کی روحانی چار دیواری میں ایک بزمِ نشاط کے انعقاد کی خبر دیتی ہیں۔ فکر و نظر کی حدوں میں وہ کم کم ہی آئے ہیں۔ اُن کے اشعار میں سیاسی اور سماجی مضامین کا بھی برائے نام دخل ہے۔ اُنھوں نے اگرچہ غیر فانی جذبات کی ترجمانی کی لیکن وہ اُن میں دائمی ولولہ انگیزی کو بھرنے میں کامیاب نہیں ہو پائے البتہ اُنھوں نے اپنی کاوشوں اور اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے کیے جانے والے عملی اقدامات کے حوالے سے اُردو زبان کے محسنین اور معماروں میں اپنی جگہ بنالی۔ ذیل کی طرحی غزل میں وحشت کی ملی جُلی خصوصیات کا عکس ملتا ہے۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر افتخار الحق ارقم / گجرات

(حال ہی میں شائع ہونے والے نعتیہ مجموعہ ''اسمہٗ احمد'' سے انتخاب)

اندھیرا باطل کا لڑکھڑایا جب آپؐ آئے
چراغِ توحید جگمگایا جب آپؐ آئے

گلِ حیا پر نکھار آیا جب آپؐ آئے
چمن مروّت کا لہلہایا جب آپؐ آئے

جو آدمی تھا جس آدمی کے لہو کا پیاسا
اُسی نے اس کو گلے لگایا جب آپؐ آئے

طبیعتوں میں بھلائیوں کا شعور اُبھرا
برائیوں کا ہوا صفایا جب آپؐ آئے

ترانۂ مرحبا الاپے وفورِ حظ سے
خوشی خوشی جھومتی رعایا جب آپؐ آئے

نگاہوں میں شرم و آبرو کی بہار مہکی
دلوں پہ چاہت کا رنگ چھایا جب آپؐ آئے

وہ عظمت زندگی جو مجروح ہو رہی تھی
اسے سکون و قرار آیا جب آپؐ آئے

قبولِ درگاہِ حق تعالیٰ ہوئیں دُعائیں
اجابتوں نے قدم بڑھایا جب آپؐ آئے

جو راہِ انسانیت سے بھٹکے ہوئے تھے ارقم
سراغِ منزل انھوں نے پایا جب آپؐ آئے

حق کی پوجا سے کھلا انکار تھا جب وہ نہ تھے
بت پرستی عام کاروبار تھے جب وہ نہ تھے

پاؤں پر اپنے کھڑا ہونے کی ہمت ہی نہ تھی
آدمی اک دوسرے پر بار تھا جب وہ نہ تھے

ایک انساں کا رویہ دوسروں کے واسطے
نیشِ عقرب اور زہر مار تھا جب وہ نہ تھے

شیوۂ مستکبری معیارِ ترجیحات تھا
کوئی قدروں کا کہاں معیار تھا جب وہ نہ تھے

کھیتیاں حُسنِ عمل کی بنجر اور بے آب تھیں
خرمنِ کردار آتش بار تھا جب وہ نہ تھے

دور دورہ تھا جہاں میں نکبت و ادبار کا
آدمی یوں ہی ذلیل و خوار تھا جب وہ نہ تھے

حیف صد حیف ابنِ آدم بنتِ حوا کے لیے
بھیڑیے سے بھی سوا خوں خوار تھا جب وہ نہ تھے

ایک تو راہیں بھی تھیں نامستقیم و منحنی
دوسرے رہرو بھی کج رفتار تھا جب وہ نہ تھے

روشنی کی اک کرن بھی تھی نہ تا حدِ نگاہ
تیرگی کا دور اک آزار تھا جب وہ نہ تھے

ہر کوئی اپنا جدا معبود رکھتا تھا یہاں
کس کو اک اللہ کا اقرار تھا جب وہ نہ تھے

ان کے آنے سے ہوئی آسان راہِ زندگی
ورنہ یہ رستہ بہت دشوار تھا جب وہ نہ تھے

جہالت کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے آئے
چراغِ حکمت و عرفاں جلانے کے لیے آئے

ہلاکت کے شکنجے سے چھڑا کر ابنِ آدم کو
فلاح و خیر کا رستہ دکھانے کے لیے آئے

کسی مخصوص مدت کے لیے بعثت نہیں ان کی
محمدؐ تا ابد سارے زمانے کے لیے آئے

جو بندے دور ہوتے جا رہے تھے حق تعالیٰ سے
قریبِ حق تعالیٰ ان کو لانے کے لیے آئے

یقیں کی بستیاں آباد کرنا ان کا مقصد تھا
توہم کے صنم خانے گرانے کے لیے آئے

وہ ہر میدان میں ہر موڑ پر ثابت قدم ٹھہرے
حوادث پے بہ پے گو ڈگمگانے کے لیے آئے

ہمارے باہر اور اندر کی دُنیا جگمگا اُٹھے
اطاقِ جاں میں آئینے سجانے کے لیے آئے

اُسے کھانی پڑی منہ کی رہے ناکام وہ ارقم
کوئی کتنا بھی ہم کو ورغلانے کے لیے آئے

رسولِ توبہ و رحم و مراحم
سراپا رحمت و عفو و ملاحم

امینِ عالمین و اصدق الناس
رئیس راستین و قدس الاقداس

سراپا طلعت و تنویر و تنویں
ہے ان کی زیست کا ہر باب زرّیں

ہوئی ہے ان پہ تکمیلِ مکارم
انھوں نے ڈھائے ایوانِ محارم

غرورِ نسل و ملت کو مٹا کر
کیے ادنیٰ و اعلیٰ سب برابر

کریں الحاد کی تاریکیاں چاک
غلاظت سے کریں ماحول کو پاک

رقوم خیر کا ہیں وہ صحیفہ
ہے نام اُن کا دو عالم کا وظیفہ

ہو اُن کا منکر و کافر جو ناداں
نہ اُترے اس سے رُخ سے خاکِ خزیاں

کرے جو سر بسر اُن کی اطاعت
نہ اُس کو چھو سکے نارِ ضلالت

ہوائے حق پرستی ہے اُنھی سے
بہارِ نخلِ ہستی ہے اُنھی سے

سر شکِ یادِ محبوبِ خدا سے
دُھلا دامانِ عصیاں ہر خطا سے

شمولِ آرزو منداں رہوں میں
ہمیشہ خرم و خنداں رہوں میں

ہے نشہ آپؐ کی اُلفت کا دل میں
اسی سے تازگی دنیائے گل میں

زباں پر آپؐ کا اسمِ گرامی
گلے میں آپؐ کا طوقِ غلامی

ڈاکٹر ایوب ندیم/لاہور

مدحتِ مصطفیٰؐ ضروری ہے
ورنہ یہ زندگی ادھوری ہے
راحتِ عشقِ مصطفیٰؐ کے سوا
ہر خوشی خام ہے، عبوری ہے
اُنؐ کی چاہت نہ جس میں شامل ہو
وہ حضوری بھی بے حضوری ہے
اُنؐ سے قائم ہے عظمتِ انساں
اُنؐ سے یہ کائنات پوری ہے
کہہ رہی ہے فضائے بدرو حنین
اُنؐ سے اُلفت بہت ضروری ہے
اُنؐ کے در تک رسائی چاہتا ہوں
جاں بہ لب ہوں کہ اُنؐ سے دُوری ہے
نعت ایوبؔ ہے عطا اُنؐ کی
میری کوشش کہاں شعوری ہے

جب حرا سے چاند اُبھرا نُور کا
چار سُو پھیلا اُجالا نور کا
تھے ابھی آدم میانِ آب و گل
میم سے اِک نام چمکا نور کا
اُن کی خاطر اس زمیں تا آسماں
رب نے اِک رستہ بنایا نور کا
اُنؐ کے ہر قول و عمل میں روشنی
دیکھا عالم نے سراپا نور کا
اُن کی رحمت کی کوئی حد ہی نہیں
بہتا جاتا ہے یہ دریا نور کا
کیسے اک بے نور سمجھے نور کو
چشم و دل میں ہے دریچا نور کا
ہم کو بھی اُن کی شفاعت ہو نصیب
کاش مِل جائے سہارا نور کا
سب درود اُنؐ پر اور اُنؐ کی آل پر
اُنؐ سے قائم ہے یہ رستا نور کا

عنایت اُنؐ کی یہ مجھ پر بسا اوقات ہوتی ہے
میں اُنؐ کا نام لیتا ہوں، تو خود ہی نعت ہوتی ہے
جُڑے رہنا ضروری ہے گلستانِ محمدؐ سے
اِسی گلشن میں رحمت کی سدا برسات ہوتی ہے
صحابہؓ نے کہا: کیسے بیاں ہو گفتگو اُنؐ کی
مہکتی ہے فضا ساری، جب اُنؐ سے بات ہوتی ہے
گواہی دے رہی ہے کہکشاں معراجِ نبویؐ کی
فلک پر خود اُبھر آتی ہے جوں ہی رات ہوتی ہے
کہاں پھولوں کی قسمت میں مہک اُنؐ کے پسینے کی
وہ دنیا میں کہاں! جنت کی جو سوغات ہوتی ہے
میں جب بھی نعت کہتا ہوں بہت سرشار ہوتا ہوں
مجھے لگتا ہے اُنؐ کی خاص رحمت ساتھ ہوتی ہے
وہؐ چاہیں تو پڑھیں کلمہ یہ پتھر بھی محبت سے
نہ اُنؐ کی بات جو مانے، اُسی کو مات ہوتی ہے
تمنا ہے سناؤں نعت جا کر اُنؐ کے روضے پر
مگر اب دیکھیے کیا صورتِ حالات ہوتی ہے

قرآں کے لفظ لفظ میں جلوے ہیں آپؐ کے
حرفِ مقطعات تو پردے ہیں آپؐ کے
شق القمر سے ساعتِ معراج عرش تک
چشمِ فلک نے معجزے دیکھے ہیں آپؐ کے
بی بی بتولؓ آپؐ کے گلشن کا ہیں گلاب
زینبؓ، حسنؓ، حسینؓ تو غنچے ہیں آپؐ کے
دل دل میں جو بسی ہے محبت ہے آپؐ کی
سینے میں جو نہاں ہیں خزینے ہیں آپؐ کے
آپؐ آئے، کائنات کی قسمت چمک اُٹھی
کون و مکاں میں سارے اُجالے ہیں آپؐ کے
روزِ ازل سے آپؐ کے قدموں کے منتظر
خورشید، چاند اور ستارے ہیں آپؐ کے
رہتا ہے ہر زباں پہ سدا ذکر آپؐ کا
یہ صبحیں آپؐ کی ہیں، شبینے ہیں آپؐ کے
ایوبؔ، دشمن آپؐ کے گم نام ہو گئے
لیکن جہاں میں آج بھی چرچے ہیں آپؐ کے

کاش! ایسا مجھ میں ذوقِ تمنا دکھائی دے
آنکھیں جو مُوند لوں تو مدینہ دکھائی دے
پیڑوں کی چھاؤں چھوڑ کر نکلوں سفر پہ میں
پھر دھوپ کا بھی لطف دوبالا دکھائی دے
کچے گھڑے سے پار ہو دریا فراق کا
کچا گھڑا بھی مجھ کو سفینہ دکھائی دے
روشن ہوں یوں یہ آنکھیں مری اُنؐ کے نام سے
مجھ کو اندھیرے میں بھی اُجالا دکھائی دے
جو مانگنا ہے مانگ لے خیرالانامؐ سے
لیکن تری طلب میں قرینہ دکھائی دے
راس آئے مجھ کو اُنؐ کے نواسے کی پیروی
چاہے ہر ایک شخص بدلتا دکھائی دے
دے گا گواہی خود ہی زمانہ یہ آخرش
ہر اِک زمانہ اُنؐ کا زمانہ دکھائی دے
ایوبؔ اُنؐ کے روضے کی جانب مَیں جب چلوں
روضہ بھی میرے دل میں اترتا دکھائی دے

روشنی کی جھلمل میں طنطناتی شاعری

عبدالوحید بسمل

کسی بھی کتاب یا فن پارے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اسکے منصہ شہود پر آنے کے بعد کون کونسے نئے علمی و فنی مباحث چھڑتے ہیں اور ان مباحث میں ایک عام قاری سے لیکر معاشرے کے کون کون سے سیگمنٹ حصہ لینے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ پھر یہ بھی خاص اور قابل ذکر بات جانی جاتی ہے کہ ان مباحث سے حاصل ہونے والے نتائج اور زیرِ بحث آنے والے نکات کی تشریح و توجیح معاشرے کی ادبی اور علمی ذخیرے میں کس حد تک اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

اور الحمدللہ، جنابِ واحد سراج صاحب کے پہلے شعری مجموعے نے سامنے آتے ہی ان کے کلامِ متصف سے زیادہ اپنے عنوان کے حوالے سے مختلف علمی و ادبی مباحث چھیڑ کر اپنی اہمیت کا عمدہ اعلان کر دکھایا۔ بہت سے عالم و فاضل شعرا، ان گنت صاحبانِ فہم و ادراک ادبا اور متعدد اہلِ فراست دانشوران اس عنوان کے سحر میں یوں مسحور ہوئے کہ ہر ایک نے اپنے تئیں اس پر اظہارِ خیال کیا اور خوب کیا۔ عنوان کیا ہے۔ ایک علمی امتحان ہے۔ ''روشنی ایک جادثہ ہے'' ۔ جی ہاں امتحان ہے یہ سائنسی علوم کے متوالوں کا۔ امتحان ہے یہ دینی اور الہامی علوم کے جاننے والوں کا۔ امتحان ہے یہ عمومی علوم کے دلدادگان کا۔ اور پھر امتحان ہے یہ ادبی دنیا کے ناقدین اور مبصرین کا۔ کہ روشنی ایک حادثہ ہے۔ صرف اس بیان کی تائید، تشریح یا ممکنات کے شواہد اور حوالے پیش کر کے اپنا فرض ادا کیا جائے یا اس عنوان کے تحت سامنے آنے والی کتاب کی تفہیم اور اس کے تخلیق کار کی لگ بھگ نصف صدی کی ریاضت، زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی، رموزِ کائنات سے ملنے والے اشاروں کی تفہیم، کارہائے زمانہ پر آفاقی تناظر میں وجدانی رسائی، حادثات زمانہ سے سسکتی بلکتی انسانیت کی حالتِ زار پر اظہارِ افسوس، علومِ صحیحہ سے روگردانی پر تاسف اور سب سے بڑھ کر روشنی کے الہامی اور آفاقی مطالب سے مکمل آشنائی کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے ایک شاہکار شعری مجموعے کی اشاعت پر اس کی علمی، ادبی سماجی اور معاشرتی اہمیت کے حوالے سے کچھ کہا جائے۔

اس شاہکار شعری مجموعے پر بہت سی تقاریب اور ان میں ہونے والی گفتگو میں جو کچھ کہا اور سنا گیا اسمیں عنوان پر تو عالمانہ و فاضلانہ بات چیت بدرجہ اُتم کی گئی مگر اس شاہکار کتاب کے بہت سے قابل ذکر اور لائقِ داد و تحسین مشمولات عنوان کی چکا چوند میں اپنی چمک اور آب و تاب دکھانے میں کچھ پیچھے رہ گئے۔

اس میں شک نہیں کہ کتاب کا ٹائٹل ہے ہی اتنا بھرپور، وسیع الجہات، جاذبِ نظر و فکر اور وسیع المطالب کہ ایک تقریب کے تناظر میں کسی مبصر عالم کا ممکنہ وقتِ گفتگو اس مجموعۂ کلام کے دیگر پہلوؤں پر کچھ کہنے لکھنے کا شاید ہی متحمل ہو پاتا ہو اور پھر ایک اور بات کہ مجموعی طور پر اس اہم شعری کاوش کا ایک بڑا حوالہ بھی عنوان کے گرد ہی گھومتا نظر آتا ہے۔ تاہم کتابِ مذکورہ کا عمیق مطالعہ ہمیں اس کی ہمہ گیری اور متنوع موضوعات پر مصنف کے بلند و بالا علمی مقام، آفاقی مشاہدات، ذاتی تجربات، اور انسانی ہمدردی اور اصلاح احوال کے جذبے سے سرشار احساسات و جذباتِ حمیدہ سے کشیدہ شذرات، زبان و بیاں کی ارفعیت کے ساتھ اعلی ذوقِ نظر سے چنیدہ الفاظ و تراکیب، کیف آفریں قافیہ و ردیف، اچھوتے مضامین، عمدہ تصورات، مستند تلمیحات، قلیل و طویل بحور کا استعمال، اردو اور ہندی کے حسین امتزاج سے نمو پانے والی دلکش شعری فضا کے حسین خد و خال اور اس سے بڑھ کر خیال کی پختگی اور الفاظ کے دروبست میں بلا کی شائستگی اس امر کی متقاضی ہے کہ عنوان کی درخشندگی سے قطع نظر بھی اس کتاب کو دیکھا جائے۔ جس میں جنابِ واحد سراج جیسی مایہ ناز علمی شخصیت کے گوہر ہائے نایاب کی شعری و ادبی تمکنت جلوہ نما ہے۔

جی ہاں۔ عنوان کہتا ہے روشنی ایک حادثہ ہے۔ اور جنابِ سراج اس بحث میں خود نہیں پڑتے بلکہ ایک انمول نظم کی صورت میں اس حوالے سے روشنی کے جملہ مطالب واضح کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہ بحث وہ ناقدین، مبصرین اور قارئین کے لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ روشنی ایک حادثہ ہے کہ نہیں، اگر یہ حادثہ ہے تو کیا یہ ایک خوشگوار حادثہ ہے، کیا روشنی حادثہ ہے یا واقعہ۔ روشنی پہلے ہے یا تاریکی۔ البتہ وہ خود بڑی عمدگی کے ساتھ صحافِ ربانی کے حوالوں سے اندھیرے کو نور کا عدم گردانتے ہیں اور تیرگی کو نور کے تار کی گرہ سے منسوب کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتلاتے ہیں کہ جونہی یہ گرہ کھلی تو فقط نور کا ہی سلسلہ رہے گا۔

سبھی صحیفوں میں
نور
مذکور تھا
تبھی تو ہمیں یقیں تھا
اندھیرا خود کچھ بھی نہیں

فقط نور کا عدم ہے
یہ تیرگی صرف نور کے تار کی گرہ ہے
گرہ کھلی تو
فقط نور کا سلسلہ رہے گا
زمین پر نور کی اگر سلطنت بنی تو
ڈگر ڈگر خیریت رہے گی
نگر نگر عافیت رہے گی۔۔۔۔۔۔

یہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ جناب سراج حق اور انصاف کو روشنی سے تعبیر کرتے ہیں اور نظم کے اگلے حصے میں جن مظالم، جبر، استبداد اور ناانصافی کا ذکر ہے اسے تیرگی ہی کہا جاسکتا ہے۔ پھر اس نظم میں اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ تیرگی ایک کائنات ہے یعنی ظلم اور ناانصافی دیوہیکل ہے اور غالب ہے جبکہ روشنی یعنی انصاف اور حق و سچ اس کے مقابلے میں بہت قلیل الجثہ ہے۔ بالکل سادہ الفاظ میں یوں ہوا کہ روشنی اور تیرگی حق اور باطل کے استعارے ہیں۔ اور جناب واحد سراج نے ان استعاروں کو اپنے پورے کلام کا مرکزی نقطہ نظر بنا رکھا ہے، جبھی تو انکی غزلیات، قطعات، اور دیگر نظمیہ شاعری میں جابجا ان استعاروں کا عمدہ، پُر اثر اور معنی خیز استعمال موجود ہے۔ ایک غزل کا شعر دیکھیے:

اب اُس کا فیصلہ تسلیم ہوگا
لگے گی جو کچہری روشنی میں

اس حوالے سے ہٹ کر دینی و اسلامی علوم سے رغبت کی بات کریں تو مصنف کی علمی رسائی اور ذوقِ مطالعہ کی پختگی خود بولتی نظر آتی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں حمد شریف ہے جس کے چھے اشعار میں سے پانچ میں حمدِ باری تعالیٰ کے لئے مستند اور ایمان افروز تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر فرمانِ خداوندی ہے۔ (کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہُ ربک ذوالجلال والاکرام)۔ اور اس آیت مقدسہ کی روشنی میں جناب واحد سراج کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

بقا ہو یا ہو فنا کچھ نہیں ہے رہنے کا
بجز خدا، بخدا، کچھ نہیں ہے رہنے کا

اسی طرح ایک اور قرآنی آیت (الیوم نختم علیٰ افواھھم و تکلمنا ایدیھم و تشھد ارجلھم بما کانو یکسبون)۔ کے مفہوم سے ماخوذ خیال کو یوں شعری قالب میں ڈھالتے ہیں:

دینے کو ہے گواہیاں اب یہ گواہِ معتبر
دیکھیں! مرا وجود ہی میرے خلاف ہوگیا۔

جناب سراج محض ایک عمدہ شاعر اور بڑے ادیب ہی نہیں وہ ایک مایہ ناز ماہر تعلیم اور قابل تحسین معلم بھی ہیں۔ ان کا مقام جس بات کا متقاضی ہے وہ اسے بھی خوب جانتے ہیں اور اس سے عہدہ برا ہونے کا اہتمام بھی بڑی نفاست کے ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ خود بھی وقت کا ایک ثانیہ تک رائیگاں نہیں جانے دیتے اور اپنے ہم نفسوں سے بھی یہی امید رکھتے ہیں۔ مگر جس وقت انکی نظر معاشرے کی اجتماعی بے حسی اور خوابیدگی پر پڑتی ہے تو ان کی نوک قلم سے ان کے جذبات کی یوں ترجمانی ہوتی ہے:

راستے بجھتے چلے جاتے ہیں راہرو کیلیے
سونے والوں کو بہت سونے دیا جاتا ہے

وہ ایک طرف تو خفتگاں وقت کو دستک دیتے ہیں تو دوسری جانب دنیا کو دارالاسباب کے طور پر بھی جانتے ہیں اور اس کی دارالامکانات کی تعریف سے بھی واقف ہیں۔ میری اور ان کی رفاقت کوئی دو دہائیوں پر محیط ہے اور اس دوران متعدد مقامات پر میرا ذاتی مشاہدہ رہا ہے کہ انھیں مستحکم شواہد اور مضبوط دلائل بھی کسی کے منفی رویے اور منفی سوچ سے ناامیدی کی مبین ممکنہ فضا تک لے جانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے، بلکہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے کوئی ایک ایسا مثبت پہلو نکال لیتے ہیں کہ دوسرے کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسی حوالے سے ان کے کلام میں بھی یہ خوبی نمایاں ہے۔ شعر دیکھیے:

یقیں میں ہیں جو پیوند بے یقینی کے
تو خواہشوں میں بھی اک رنگ احتمال کا ہے
سیاہ رات میں رستہ دکھا گئی تھیں مجھے
جلا کے مشعلِ امید، مہرباں آنکھیں

اس کے ساتھ ہی ان کی نظر فلسفہ حیات کی دبیز تہوں میں پوشیدہ اسرار و رموز پر بھی رہتی ہے اور ان کی واقفیت سے ایک ایسی فضا قائم ہوتی ہے جس میں تسلی اور تشفی کا عنصر نمایاں ہے۔ ذرا آگے چلیں تو یہی فضا نفسِ مطمئنہ کی صورت نمایاں ہوتی ہے اور وہ کہہ اُٹھتے ہیں:

کیا برائی ہے جو میں کامل نہیں
اکملیت، زیست کا حاصل نہیں
وہ حفاظت سے مجھ کو رکھتا ہے
اپنی مرضی سے مارنے کے لئے
میں نے لوگوں پہ وار دی ساری
زندگی تھی ہی وارنے کے لئے

اور یہی نفس مطمئنہ جب اپنے اردگرد موجود قرابت داروں کے روّیوں پر نظر دوڑاتا ہے اور قدم قدم پر رشتوں کی ناقدری اور معمولی لغزشوں اور چپقلشوں پر بھی قطع تعلقی کے مناظر دیکھتا ہے تو چیخ اُٹھتا ہے:

ذرا سی بات پر رشتوں کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں
پھر اس کے بعد یوں ہوتا ہے، گھر تقسیم ہوتے ہیں
تیرے لبوں کے تصدق پہ میں نثار مگر
سنا رہی ہیں کوئی اور داستاں، آنکھیں

زیر نظر کتاب کی ورق گردانی ہمیں یہ بھی بتاتی

ہے کہ صاحبِ کتاب کسی پیرِ مردِ جہاندیدہ کی طرح اپنے چہار سو رونما ہونے والے ماضی و حال کے احوال سے بھی واقف ہیں اور ان احوال کی جزیات کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ شکاگو کے مزدوروں کی جد جہد کی پاداش میں نہ جانے کتنوں کو موت کی آغوش میں جانا پڑا تھا اور پھر مغرب کی جادوگری اور فسوں کاری پر نظر ڈالیے۔ پہلے ان کو نیست و نابود کر ڈالا اور پھر ان کی یاد میں دنیا بھر کے محنت کشوں پر احسان جتاتے ہوئے بین الاقوامی یوم مزدور کا ڈھونگ رچا کر اپنے کرتوتوں کی پردہ پوشی کا سامان مہیا کر دیا۔ مگر جنابِ واحد کی بصارت اور بصیرت کا اندازہ لگائیے کہ انھوں نے اس موضوع کو کن استعاراتی الفاظ کی ایک ترکیب ''ادھورا اسمِ اعظم'' سے منسوب کیا ہے، یہ عنوان ہی میرے گزشتہ الفاظ کی تائید کے لیے ایک سند سے کم نہیں۔ اس نظم میں انھوں نے پورے سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیوں کی نہ صرف عکاسی کی ہے بلکہ محنت کش کی عظمت و اہمیت کو اُجاگر بھی کیا ہے۔ اور اسکی مسلسل بے بسی کے پسِ پردہ کرداروں کا چہرہ بھی بے نقاب کیا ہے۔ اس نظم کے اختتامی دو مصرعے انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی وہ قوت اور صلاحیت رکھتے ہیں جو رستمِ زماں بھولو پہلوان کے پاس بھی نہیں تھی۔ وہ دو مصرعے ملاحظہ کیجئے:

کسی نادیدہ برگد کا
یہاں سایہ گھنیرا ہے

احبابِ ذی وقار میں جانتا ہوں کہ آج کے مصروف ترین دور میں طوالت مضمون گراں گذرتی ہے مگر کچھ کتابیں، کچھ رائیٹر ایسے حوالے ہوتے ہیں جن کو پڑھنا، جن پر لکھنا اور جن کے بارے میں کچھ کہنا وقت کی اہم ترین ضرورت بن کر سامنے آتا ہے اور ساتھ ساتھ لکھنے اور پڑھنے والے کی اپنی علمی اور تفہیمی استعداد میں خاطر خواہ اضافے کا سبب بنتا ہے، اور الحمد للہ! روشنی ایک حادثہ ہے اور اسکے تخلیق کار جناب واحد سراج انھی معروف حوالوں میں سے ایک ہیں۔

خدا لگتی کہوں تو اس کتاب کی ہر ہر نظم اپنے اندر ایک مکمل کتاب کا مواد رکھتی ہے مگر جناب سراج کے قلم کے کمالات دیکھیئے کہ بڑے سے بڑے مضمون کو نظم کی تمام تر خوبیوں اور محاسن سے ثروت مند کرتے ہوئے تلخیص، اختصار اور اثر پزیری کے اوصاف کے مرقعے بنا کر پیش کر دیئے ہیں۔ نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی نے اردو اور ہندی کے لفظی امتزاج سے بننے والی مسحور کن فضا اور نظم کی موسیقیت سے حظ اٹھانا ہو یا ایک بہت ہی پیارے، میٹھے اور انمول رشتے کے پیچھے کارفرما جذبات کی شدت کا اندازہ لگانا ہو تو وہ جناب سراج کی ایک لوری ''جُونے دا کے لیے'' (جو انھوں نے اپنی پیاری بیٹی کیلئے بہت پہلے لکھی تھی) کا مکمل انہماک سے مطالعہ کرے۔ اگر کشائش لفظی کے کرشمے دیکھنے ہوں تو ان کی نظم ''وے بکھیا'' پڑھ لیں جو صرف بیس الفاظ پر مشتمل ہے مگر ایک بڑے قرآنی حوالے: (نحن اقرب علیہ من الخبلا لورید) کے مفہوم کو واضح کرتی ہے۔

محبت کی حقیقت جاننا چاہیں تو نظم ''پچھل پیری'' محض بیس الفاظ میں فلسفہ کربلا کو جاننا ہو تو ان کی نظم ''راکھ سے بنتے لاکھ''، مسلم امہ کے انحطاط کی وجہ جاننا چاہیں تو ان کی نظم ''ہارتی سپہ کا سالار'' دیکھ لیں۔ اور اگر اب بھی روشنی اور تیرگی کے سمجھنے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہو تو پھر ان کا نذرانہ محبت بنام ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا عمیق مطالعہ کریں۔ تاکہ آپ کو ایک استعاراتی فضا میں رقصاں الفاظ اور تراکیب اپنی معنوی پرتیں کھولتے نظر آئیں اور آپ کیلیڈوسکوپ کے گھومنے، مومی کاغذ سے بنی سکرین، روشن خاک پر انمٹ اندھیرے، چھاتی پیٹتی چمگادڑوں کا اندھی اندھیری رات کی ہیبت کا حصہ بن جانے، کچھ سر پھرے جگنوؤں کے امیدِ صبح کی جل بجھ لیے سوادِ شب کے طول و عرض میں اُڑنے، شمشیر سے لٹکی ہوئی میزان کے نیچے کھڑے پاسبان کے سگریٹ کے کش لگانے سے ابھرنے والی سسکاری سے اس کی کج کُلاہی کے اور بڑھنے، اور پھر رنج میں لتھڑے ہوئے اس منظر کے ابھرنے کی قابلِ دید عکاسی جس میں سوا نیزے پر آئے ہوئے سورج کی عدالت کے کٹہرے میں ان سارے سر پھرے جگنوؤں کا کھڑا ہونا، آپ کو ایک ایسی دنیا کی سیر کراتا ہے جس کا تصور بھی کبھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر زمانے نے یہ سب کچھ اپنی کھلی آنکھ سے دیکھا اور سوائے تاسف اور بے بسی کے کچھ بھی نہ کر پایا۔ اور اب یہ سب استعارے اپنے انمٹ نقوش لئے ایک ایسے تمثال گر کے شاہکار کے طور پر آنے والی دنیا تک اس روشنی کی تلاش میں سرگرداں رہیں گے جس کی لو سے حق و باطل کے درمیان واضح لکیر کھینچی جا سکے اور روشنی تیرگی پر حاوی رہے۔

آخر میں جناب واحد سراج صاحب کو اس شاہکار شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ ہی یہ دو اشعار بغیر کسی تبصرے کے آپکی سماعتوں، بصارتوں اور بصیرتوں کی نذر کرتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں۔

وہ میرا ہو کے بھی میری دسترس سے باہر ہے
مجھی میں رہتا ہے اور میرے بس سے باہر ہے
وہ نور ہے تو نہایا نہیں بدن اس میں
وہ حرف ہے تو ابھی دسترس سے باہر ہے

خدا

خدا کا تصور اُتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان۔ انسان اپنے اظہار کے لیے ابتدا سے ہی شاعری اور آنسوؤں کا سہارا لیتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں تصویر کشی، مجسمہ سازی اور شاعری کو انسان کی اوّلین زبانیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ قدیم کتبے ہمیں نثر کی بجائے شاعری میں ملتے ہیں جس میں خدا کے حضور حمد و ثنا بیان کی گئی ہے۔ مٹ چکی تہذیبوں کے آثار میں بھی خدا کی ثنا سے متعلق نظمیں ملتی ہیں اور دنیا کے تمام مذاہب کی الہامی کتابوں کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ مغربی شاعری ہو یا مشرقی۔ اُس میں بھی عموماً خدا کی حمد یا خدا سے متعلق شاعری کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ اُردو غزل کی روایت میں بھی خدا سب سے بڑا موضوع رہا ہے۔

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
(درد)

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا
(میرؔ)

نہ کچھ تھا تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
(غالبؔ)

روایت کی طرح تصورِ خدا جدید اردو غزل کا بھی بڑا موضوع رہا ہے۔ اردو غزل کے آغاز سے لے کر مسلسل ہم دیکھتے آ رہے ہیں کہ جن معاشروں میں اردو غزل نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہاں خدا کی ہستی سے انکار کے امکانات کبھی موجود نہیں رہے۔

یہ آگ یہ پانی یہ ہوا ہے کہ نہیں ہے
اب سوچ مرے دوست خدا ہے کہ نہیں ہے
(حالیؔ)

جدید اُردو غزل میں خدا سے متعلق سب سے نمایاں اور مؤثر اظہار ہمیں اقبال کے ہاں ملتا ہے اور اس میں جستجو بھی ہے اور اثبات بھی۔

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا
(اقبالؔ)

جدید غزل میں آگے چل کر بندے اور خدا کے رشتے میں ایک طرح کا گلہ مندانہ لہجہ اُبھر آتا ہے۔ یہ حوصلہ بھی جدید غزل کو اقبالؔ نے شکوہ جوابِ شکوہ لکھ کر بخشا اور اُس نے فیضؔ کی زبان سے اُسے بالکل نیا آہنگ عطا کر دیا۔

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
(فیضؔ)

خدا سے انسان کا گلہ کرنے کا عمل اپنائیت کے احساس اور موثر ہونے کے شعور کے بغیر ممکن نہیں۔
بقول ڈاکٹر سعد اللہ کلیم:

''یوں لگتا ہے جیسے جدید اُردو غزل بندے اور خدا کے ناگزیر رشتے کا کسی برتر سطح پر ادراک کرنا چاہتی ہو اور فی الوقت ایک عبوری دور سے گزر رہی ہو۔''(۲)

جدید غزل میں خدا کے مضمون کو وقت، حالات اور زمانے کے مطابق برتا گیا اور اس میں مزید وسعت پیدا ہوتی گئی۔ انسان جس دکھ اور کرب سے گزرا اُس نے کسی نہ کسی حوالے سے اس کا شکوہ ضرور کیا:

تو نے عصمت فروخت کی ہے فقط
اک ذرا بھوک ٹالنے کے لیے
لوگ یزداں کو بیچ دیتے ہیں
اپنا مطلب نکالنے کے لیے
(عبدالحمید عدمؔ)

بیسویں اور اکیسویں صدی میں خدا کی ذات اور انسان کے باہمی تعلق کا منفی اور مثبت دونوں حوالے سے ملا جلا رجحان ملتا ہے اور جدید غزل گو شعرا نے اس حوالے سے جراتِ رندانہ سے کام لیا ہے۔

جب لوگ یہ کہتے ہیں خدا دیکھ رہا ہے
میں دیکھنے لگتا ہوں کہ کیا دیکھ رہا ہوں
(سید مبارک شاہ)

کشیدہ کارِ ازل تجھ کو اعتراض تو نہیں
کہیں کہیں سے اگر زندگی رفو کی جائے
(عباس تابش)

یہی محنتوں کا صلہ رہا تو پھر اے خدا
مجھے لطف رزقِ حلال میں نہیں آئے گا
(قمر رضا شہزاد)

ڈاکٹر سعد اللہ کلیم کے بقول:

''جدید غزل میں خدا کا شعور و احساس اس طرح ہیں جس طرح دودھ اور شکر گھل مل کر ہم جان ہو جائیں اور اپنی منفرد حیثیت کو کھو بیٹھیں۔''(۳)

ہو کوئی مسئلہ اپنا دعا پر چھوڑ دیتے ہیں
اُسے خود حل نہیں کرتے خدا پر چھوڑ دیتے ہیں
(صابر رضا)

یوں تو خدا سے متعلق اُردو جدید غزل کے ہر شاعر نے اپنے انداز میں سوچا ہے۔ مگر روایت اور جدت میں ایک بات مشترک ہے کہ شعرا نے خدا سے مکمل آزادی اور بغیر کسی ڈر خوف کے اپنے دل کا حال اور اپنی بے اختیاری کا ذکر کیا ہے۔ جدید شعرا کے ہاں یہ شعری احساس نمایاں ہے۔

میں نے تنہائی سے تنگ آ کے اُسے یاد کیا
اب مرے ساتھ ہی رہتا ہے خدا زنداں میں
(منظور عارف)

مکافاتِ عمل خود راستہ تجویز کرتی ہے
خدا قوموں پہ اپنا فیصلہ صادر نہیں کرتا
(عاصی کرنالی)

اتنا خالی تھا اندروں میرا
کچھ دنوں تو خدا رہا مجھ میں
(جون ایلیا)

اے قاسم اشیاء تری تقسیم عجب ہے
دستار انہیں دی ہے جو سر بھی نہیں رکھتے
(انور جمال)

پڑ گیا ہے خدا سے کام مجھے
اور خدا کا کوئی پتہ ہی نہیں
(فیضی)

خدا کے ساتھ یقین اور گمان کا یہ تسلسل روزِ اوّل سے چلا آ رہا ہے۔ خدا ایک سوالیہ نشان کی طرح ہمیشہ اہلِ دانش اور تخلیق کاروں کے ذہنوں میں رہے گا۔

چھوٹے چھوٹے لوگ خدا ہیں
ویسے تیری خدائی ہے ناں
(لبنیٰ صفدر)

خدا سے تعزیت کرنی ہے مجھ کو
کسی ماں کا جواں بیٹا مرا ہے
(عمران نقوی)

سکوں کی تیسری صورت نہیں ہے کوئی ہستی میں
خدا بن جائے یا پھر آدمی دیوانہ ہو جائے
(محشر زیدی)

سفینے ڈوب گئے کتنے دل کے ساگر میں
خدا کرے تری یادوں کی ناؤ چلتی رہے
(حسن اختر جلیل)

غبار تھا، غبار بھی نہ رہا
خدا کا انتظار بھی نہ رہا
(ادریس بابر)

انسان اس وسیع و عریض کائنات میں اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود خود کو مجبور، بے اختیار اور مظلوم گردانتا ہے۔ نہ ابتدا کی خبر نہ انتہا معلوم۔ اوپر سے قدرتی آفات، بیماریاں، دکھ مسائل زندگی کے بعد موت کا ڈراؤنا خواب اس ساری صورت حال میں کبھی کبھی وہ تنگ آ کر اتنی جرات بھی کر لیتا ہے کہ

رو کے اُٹھے مژہ کو صاف کیا
اے خدا جا تجھے معاف کیا
(رفیق اظہر)

بہر حال جب تک اردو غزل لکھی جاتی رہے گی خدا ہمیشہ بڑے موضوع کے طور پر غزل کا حصہ بنا رہے گا۔

⊙⊙⊙

غزلیں — لبنیٰ صفدر/ لاہور

گزر رہا ہے یہ دن شام اُترنے والی ہے
کہ تیرے قرب کی خواہش سنورنے والی ہے
بس آنے والی ہے اک خوش بدن کی یاد ابھی
ذرا سی دیر میں خوشبو بکھرنے والی ہے
دکھائی دیتی ہے جو آنکھ رنگ سے عاری
بس ایک پل میں یہ رنگوں سے بھرنے والی ہے
ہے تیرے قرب کا موسم ذرا سی دیر یہاں
کہ رُت وصال کی بس اب اُترنے والی ہے
بہار آنی ہے مجھ کو یقین ہے لبنیٰ
خزاں کی شام یہاں سے گزرنے والی ہے

درمیاں پردہ نہ پھر کوئی بھی حائل رکھا
اس طرح چاہا اُسے خون میں شامل رکھا
اک اشارہ تھا کسی آنکھ کے رستے جیسا
ایک چہرہ تھا جسے حاصلِ منزل رکھا
جب جواں ہونے لگی پاؤں کو زنجیر کیا
نام جس لڑکی کا ماں باپ نے پائل رکھا
اُس نے کشکول میرے ہاتھ کو بننے نہ دیا
ایک در کا میرے رب نے مجھے سائل رکھا
ایک ہی خواب دریچہ تھا جہاں پر لبنیٰ
اپنی آنکھیں بھی وہیں رکھیں، وہیں دل رکھا

طرحی غزل

احمد ندیم رفیع

امریکا

زبانِ حال سے کیا کیا بتائیں
اُڑا کر لے گئیں کیا کچھ ہوائیں

جہاں اک سانحہ گزرا ہو سب پر
وہاں اپنی کتھا کس کو سنائیں

ہم اس محبس میں گم ہیں جسکے باہر
ہوا کرتی ہے دن بھر شائیں شائیں

رواں ہیں پانیوں میں عکس کیا کیا
کسے دیکھیں ، کہاں پتھر گرائیں

سبھی اپنے سفر پر گامزن ہیں
کسے روکیں ، کسے واپس بلائیں

جسے بھولے ہوئے ہیں مدتوں سے
چلو اس کام کا بیڑا اٹھائیں

یہ آنسو اب پُرانے ہو چکے ہیں
انہیں پی جائیں یا ان کو بہائیں

دلِ نا گفتہ بہ کی حالتِ زار
کبھی خود سے کبھی تم سے چھپائیں

جو رشتہ منطقی انجام پر ہے
اسے دو لخت کر دیں یا بچائیں

بہارِ جاں فزا بھی اک سزا ہے
مکدّر ہوں اگر دل کی فضائیں

اٹھائیں کب تلک یادوں کی گٹھڑی
کہو تو ہم تمہیں بھی بھول جائیں

یہ کس خواہش کا کاگا جاگ اُٹھا
مسلسل سن رہا ہوں کائیں کائیں

کرم کی تتلیاں منڈلا رہی ہیں
انہیں چومیں کہ پلکوں پر بٹھائیں

ان آنکھوں میں کچھ ایسی دلکشی ہے
کہ جی کرتا ہے ان میں ڈوب جائیں

تجھے الفاظ کا آہنگ دے کر
مثالِ مصرعۂ تر گنگنائیں

مرے خلوت کدے میں گونجتی ہیں
مرے ہم زاد کی وحشی صدائیں

سرِ دشتِ تمنا چھا رہی ہیں
کسی نادیدہ موسم کی گھٹائیں

ہم ایسے جھنجھٹوں میں پھنس گئے ہیں
کہ اب ممکن نہیں دامن چھڑائیں

اُن آنکھوں سے ہمیں کیا لینا دینا
انہیں خود شوق ہے جادو جگائیں

ٹھٹھرتی سردیوں کی دھوپ اوڑھیں
کہیں مل بیٹھ کر چلغوزے کھائیں

خیالِ یار کی نازک سی پریاں
مری مٹھی میں آ کر تلملائیں

شناسائی کی بوندیں گر رہی ہیں
چلو کچھ دیر ہم تم بھیگ آئیں

اگر ہم چل پڑیں اپنی ہی جانب
تو ہو سکتا ہے تم کو ڈھونڈ پائیں

تری خوشبو ، تری سانسیں ، ترا دل
سمجھ آتا نہیں کیا کیا چُرائیں

دما دم رقص کرتے آؤ تم بھی
مزارِ عشق پر چادر چڑھائیں

بہشت و حُور سے بہلانے والے
کسی ''طاغوت'' سے ہم کو ڈرائیں

ہم اپنا مدعا بتلا چکے ہیں
ذرا سی آپ بھی زحمت اُٹھائیں

امورِ باہمی کا ہے تقاضا
کہ اب کچھ سلسلہ آگے بڑھائیں

گلے مل کر منا لیتے ہیں خوشیاں
ضروری تو نہیں ساغر لنڈھائیں

برستی چاندنی میں چاند تنہا
تم آ جاؤ تو مل جل کر نہائیں

چُنیں گے راستہ تب بھی وہی ہم
اگر بیتے ہوئے دن لوٹ آئیں

یہ کیسی دھن میں ہیں تیرے مسافر
کبھی کانٹے ، کبھی پتھر بنائیں

محبت نام ہے اندھے یقیں کا
محبت کو بھلا کیوں آزمائیں

ہمارا دل وہ مسکن ہے جہاں پر
سنائی دیتی ہے بس سائیں سائیں

جگا جاتے ہو تم جن خواہشوں کو
انہیں ہم تھپکیاں دے کر سُلائیں

ہمارا بس چلے تو رفتگاں کو
کسی پاتال سے بھی ڈھونڈ لائیں

کبھی خود داریوں کا ڈھول پیٹیں
کبھی اپنی انا کے بُت گرائیں

گھرے ہیں آئنوں کے درمیاں ہم
کہاں دیکھیں ، کہاں پردہ گرائیں

ہمارے شعر کس لائق جہاں سب
تمہاری چاہتوں کے گیت گائیں

بھرے زخمِ تمنا کیا اگر سب
تمہارا نام لے کر ظلم ڈھائیں

جنہیں خدشات نے گھیرا ہوا ہو
وہ اپنے آپ سے کیا بھاگ پائیں

کبھی جزوِ رگِ جاں تھی جو عادت
اب اس عفریت سے پیچھا چھڑائیں

ترے آتے ہوئے قدموں کی آہٹ
سوادِ گور میں بھی جان جائیں
کبھی مہکیں تری یادیں گلوں میں
کبھی پرچھائیاں بن کر ستائیں
ہمارا ہر نفس ہے انتظاری
ہمیں جینا ہے وہ آئیں نہ آئیں
زمانہ منتظر ہے، وقت ساکن
وہ کب بھیگی ہوئی پلکیں اُٹھائیں
کچھ ایسے بج رہا ہے سازِ ہستی
کبھی روئیں کبھی ہم مسکرائیں
نگاہِ مست کے کچھ آبگینے
مری بزمِ طرب میں کھنکھنائیں
ہزاروں خواہشوں کے مست ہاتھی
مری رہداریوں میں لڑکھڑائیں
بہت اُکساتی ہے وہ زلفِ برہم
مگر ہمت نہیں رُخ سے ہٹائیں
کئی ٹوٹے ہوئے وعدے پڑے ہیں
انہیں جوڑیں کہ ان کو بھول جائیں
غلط فہمی کی دیواریں گرا کر
کہو تو اک نئی دنیا بسائیں
شروعاتِ محبت بھی عجب ہے
کبھی جھینپیں، کبھی آنکھیں ملائیں
ترے بھٹکے ہوئے تیرِ نظر بھی
سرِ محفل مری ڈھارس بندھائیں
بظاہر متفق بھی ہیں جہاں پر
اسے کہتے ہوئے کیوں ہچکچائیں
سرشکِ غم ہو یا اشکِ ندامت
سرِ مژگاں کہاں تک جھلملائیں
یہ دردِ نا رسائی لادوا ہے
درِ امکاں کہاں تک کھٹکھٹائیں

کروں کب تک کنارہ گفتگو سے
تری خاموشیاں مجھ کو رجھائیں
حریمِ یار کی نوخیز کلیاں
مجھے خوابوں میں آ کر گدگدائیں
ہمیشہ ڈھانپ کر رکھتی ہیں تجھ کو
مرے جذبات کی اجلی ردائیں
بنی ہے جس طرح بزمِ عناصر
اسی ترتیب سے اس کو سجائیں
کسی کی جان لے کر ہی ٹلیں گی
ترے حُسنِ تغافل کی ادائیں
ہمیں بارِ دگر دیکھا ہے اس نے
ہم اپنے آپ میں کیسے سمائیں
سرِ شہرِ نگاراں رات دن ہم
تمہارے حُسن کا کندن لٹائیں
کوئی پھل توڑنے والا بھی تو ہو
ہم اپنی شاخِ دل کب تک جھکائیں
کھڑے ہیں بند دروازے کے باہر
کبھی چیخیں، کبھی گھنٹی بجائیں
کبھی اپنے گریباں میں بھی جھانکیں
جنہیں معلوم ہیں سب کی خطائیں
سُنا ہے چاند پورا ہے فلک پر
کہو تو رات کی چلمن اُٹھائیں
نہ حیراں ہو ہماری بے خودی پر
چُنی ہیں ہم نے خود اپنی سزائیں
یہ کیسے لوگ ہیں میرے جلو میں
اُٹھائے اپنے خوابوں کی چتائیں
ملا کر قوتِ برداشت اپنی
ہم اپنے آپ کو خود سے لڑائیں

✦✦✦

اسد نصیر/کینیڈا

میری جان کیسے ہو

سردیوں کی بارش میں
تیرے جسم کی حدت
میرے کانپتے لب پر ایسا اسم پڑھتی ہے
سانس جلنے لگتی ہے

آرزو ان ہاتھوں میں لمس بن کے آتی ہے
اور ایک دستک پر (تو جو راز تھی اب تک)
پرت پرت کھلتی ہے

جھاگ بحرِ امکاں کی
میرے دل کے ساحل پر
اس طرح بکھرتی ہے...

جیسے سانس لینے سے کھڑکیوں کے شیشے پر
دھند سی بکھر جائے
اور پھر حرارت سے صاف ہو کے یہ پوچھے
''آسمان کیسے ہو؟''

جیسے تیز کافی کے پہلے گھونٹ سے پہلے
جو دھواں نکلتا ہے
جو مہک بکھرتی ہے
جو سکون ملتا ہے
وہ بیان کیسے ہو

جیسے سردیوں کی شب نیند کے مسافر کو
جب لحاف ملتا ہے
اور خواب میں آ کر
کوئی اس کے ماتھے پر
ہاتھ رکھ کے کہتا ہے
میری جان کیسے ہو؟

✦✦✦

بقیہ انٹرویو: اصغر ندیم سیّد

س: معاشرتی تبدیلی Social Change اور ثقافتی نفوذ Cultural Diffusion نے جہاں تیسری دنیا کے ممالک پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ وہاں تیسری دنیا کے ممالک میں ڈرامہ نویسی بھی اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ لہٰذا ایک ڈرامہ نویس کی حیثیت سے آپ اپنی سماجی اقدار وروایات کو معاشرتی تبدیلی اور ثقافتی نفوذ سے بچانے میں کس طرح کامیاب ہوں گے؟

ج: پہلے ہماری نظر اپنے معاشرتی مسائل تک محدود تھی۔ پھر ہم لندن اور امریکہ یا دوسرے حوالوں کا موازنہ اپنے معاشرتی مسائل کے ساتھ کرنے لگے۔ ڈرامہ دوسرے ملکوں میں بنایا بھی گیا۔ دراصل اب ڈرامہ نویس ایک جدوجہد کر رہا ہے۔ بہت سارے چینلز کے آنے سے بھی ڈرامہ نویس کے لئے مشکل ہو رہی ہے۔ تاہم ڈرامہ نویس Content اور فن کی مدد سے ان مسائل سے نبردآزما ہو سکتا ہے۔ اگر اپنی اقدار، روایات اور ثقافت کو دیانت داری سے بیان کرے اور منفی ترغیبات کا تاثر تحریر پر غالب نہ آنے دے، گلیمر یا کوٹھیاں، کاریں دکھانے کی بجائے معاشرے کے مسائل کی ترجمانی کرے تو مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

س: موجودہ دور کے ڈراموں کا المیہ یہ ہے کہ ان میں نئی نسل کو منطقی حقائق کی بجائے افسانوی زندگی سے متعارف کرایا جا رہا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟

ج: یہ اس لئے ہے کہ اب ہر کوئی ڈرامہ نویس بنا ہوا ہے۔ اکثر افراد ڈرامے پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ جن کا تخلیقی تجزیہ و معاشرتی تناظر وسیع نہیں ہے۔ ان کا کوئی ادبی پس منظر نہیں ہے۔ جب یہ نہیں ہوگا یعنی انہیں اگر یہ معلوم ہی نہیں کہ مخصوص معاشرتی تضادات کیا ہیں تو وہ نئی نسل کو کیا منطقی حقائق دکھائیں گے؟ ظاہر ہے خواب ہی دکھائیں گے۔ بات وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ لکھنے والے کی گرومنگ کیسے ہوئی ہے۔

س: آج کل جو ڈرامے بنائے جا رہے ہیں، لکھے جا رہے ہیں۔ وہ بیشتر اوقات ہمارے معاشی، معاشرتی، نظریاتی اقدار و حالات کی عکاسی نہیں کرتے اس حوالے سے بتائیے کہ ڈرامے کا مستقبل کیا ہے؟

ج: دراصل اب بہت سے چینلز ہیں اور سب کی اپنی ترجیحات ہیں۔ اور ان ترجیحات کو ایڈورٹائزر طے کر رہا ہے۔ اگر میں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس وجہ سے ڈرامہ فلاپ ہو رہا ہے۔ ڈرامے کی روح ختم ہو رہی ہے۔ اس کا Content اور اسکرپٹ تباہ ہو رہا ہے۔ اگر ایڈورٹائزر ڈرامے کو اپنی ضرورت کے مطابق باقاعدہ گائیڈ کرنا شروع کر دے تو ڈرامہ فلاپ تو ہوگا ہی، مثلاً ڈرامے کا اہم سین چل رہا ہے اور درمیان میں وقفہ آ گیا یا اشتہار چلنا شروع ہو گیا۔ اور پھر ایڈورٹائزر کا یہ تقاضا کہ مخصوص اداکار ڈرامے میں ہوں۔ تو جب اسکرپٹ کی ڈیمانڈ اور ڈائریکشن ہی کو نظر انداز کیا جائے تو ڈرامے کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے۔

س: آپ نے بہت سے ڈرامے تحریر کئے، آپ اپنے کن ڈراموں کو اپنی نظر سے دیکھتے اور جانچتے ہوئے بہترین کاوش قرار دیتے ہیں؟

ج: دیکھیں جی۔ ڈرامے کا معیار سننے یا دیکھنے والا متعین کرتا ہے، البتہ میں سماجی طبقوں کے اختلاف اور طبقاتی استحصال کے حوالے سے پیاس ڈرامے کو اپنی اچھی کوشش سمجھتا ہوں۔

س: کیا آپ ڈرامے تحریر کرتے ہوئے کسی مخصوص نکتے اور فلسفے کو مدنظر رکھ کر ڈرامہ تحریر کرتے ہیں؟ یا مختلف پہلوؤں کے مطابق تخلیقی عمل میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟

ج: عموماً بنیادی فکر و فلسفہ ذہن میں ہوتا ہے۔ اس کے مطابق موضوعات اور مسائل پر لکھتا ہوں، کس ایشو کو کس طرح سامنے لاتا ہے اور کس بنیادی فلسفے کو سامنے رکھا جائے، تاہم مختلف فلسفہ حیات کے تضاد اور ادغام سے جو مسائل سامنے آتے ہیں ان کے مابین کشمکش کو سامنے رکھتے ہوئے دو تین ایشوز پر اکٹھا لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر مشروط مسائل آ جاتے ہیں، جیسے کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے ساتھ ہیومن رائٹس، معاشیاتی مسائل وغیرہ۔

س: عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ڈرامہ کرنے والا خود کو جس حد تک ڈھالنے میں کامیاب ہوتا ہے وہ کردار اتنا جاندار ہوتا ہے۔ تو کیا ڈرامہ نویس بھی کردار تحریر کرتے ہوئے خود کو متعلقہ کردار میں ڈھالتا ہے؟

ج: جی ایسا اکثر ہوتا ہے، جو کردار ہم معاشرے میں دیکھتے ہیں تخلیقی عمل کے دوران اسے خود پر طاری کر کے تحریر کرتے ہیں۔ جس طبقے کا کردار ہے ان کے رویے، اس کی زبان اور اس کے مسائل کے مطابق تحریر کرتے ہیں۔

س: آپ نے بہت سارے ڈرامائی کردار تحریر کئے، کوئی ایسا کردار جس نے حقیقی کردار کے قریب تر پرفارم کیا ہو؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ سہیل اصغر کا پیاس ڈرامے کا کردار فطرت کے نزدیک تر تھا۔ جبکہ شفیع محمد نے چاند گرہن اور فریال گوہر نے بھی چاند گرہن والا کردار بہت اچھی طرح پرفارم کیا تھا۔ یعنی جیسا میں نے تحریر کرتے ہوئے سوچا تھا۔

س: تاثر کے لحاظ سے کامیڈی ڈرامہ لکھنا زیادہ مشکل ہے یا ٹریجڈی ڈرامہ لکھنا مشکل ہے؟

ج: اصل میں بات یہ ہے کہ فن فن ہے اور وہ مشکل ہے، چاہے کامیڈی ہے یا ٹریجڈی ہے۔ بات لکھنے والے کی تربیت کی ہے۔ اگر اس میں جوہر ٹریجڈی لکھنے کا ہے تو وہ ٹریجڈی لکھے گا۔ اگر جوہر کامیڈی لکھنے کا ہے تو کامیڈی لکھے گا۔ پہلی بات ٹیلنٹ کی ہے، اور پھر اس کی گرومنگ کی ہے۔

س: کیا آپ نے ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ڈرامے کے علاوہ دوسری اصناف کے حوالے سے بھی تخلیقی کام کیا ہے؟

ج: شاعری کی حیثیت سے کیا ہے، جدید نظم میں میرا ایک رویہ اور مزاج ہے افسانے، تنقید، مضامین اور کالم لکھ رہا ہوں ناولٹ بھی لکھا ہے۔

س: آج کل کس موضوع پر لکھ رہے ہیں؟ قارئین ارژنگ کو اپنے تخلیقی سفر کے آئندہ پڑاؤ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں؟

ج: میرا چوتھا ناول مکمل ہو چکا ہے اور جلد شائع ہونے کے بعد قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہوگا۔

بقیہ انٹرویو: فقیر اللہ خاں

تعلیم مکمل کرنے کے بعد نیشنل کنسٹرکشن کمپنی (NC) میں بطور اکاؤنٹینٹ ملازمت کا آغاز کیا۔ اُن دنوں اسمبلی ہال کے سامنے پارک میں سمٹ مینار کی تعمیر جاری تھی اس لیے ہمارا بھی سمٹ مینار کی تعمیر میں زیادہ نہیں تو کچھ حصہ ضرور ہے۔

NC کے بعد پاکستان کی قابل فخر قومی ایئر لائن پی آئی اے میں شمولیت اختیار کی اور 24 سالہ سروس کے دوران چڑھتے سورج کی سرزمین سے لے کر ڈوبتے سورج کو امریکہ کے مغربی ساحل بحرالکاہل میں بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ دوران اسفار مختلف ادوار میں 25,30 ممالک کی نہ صرف سیر کی بلکہ بیرونِ ملک پی آئی اے میں تعیناتی کی وجہ سے اقامت بھی اختیار کی اور آج بھی پی آئی اے کی مدتِ ملازمت مکمل کرنے کے بعد امریکہ کے شہر نیویارک میں اقامت اختیار کر چکا ہوں۔ اس کے باوجود اپنی پیاری دھرتی کا دامن نہیں چھوڑا اور سال میں ایک دو دفعہ حاضری ہو جاتی ہے۔

ارژنگ: لکھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

فقیر اللہ خاں: جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ کالج کے میگزین میں مضامین لکھنے کا موقع ملا، لیکن پی آئی اے کی سروس کے دوران لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ اردو کے ادبی رسائل فلائٹ کریو کی وساطت سے میں جہاں بھی ہوتا باقاعدگی سے ملتے رہے جو زیرِ مطالعہ رہتے۔ ان میں اردو ڈائجسٹ، قومی ڈائجسٹ اور ''سیارہ'' ڈائجسٹ نمایاں ہیں۔ اس طرح اردو ادب سے بالکل بیگانہ نہ رہا۔ ان رسائل کے مطالعہ کے دوران دل میں ایک خواہش ضرور پیدا ہوتی کہ کاش میں ان اردو کے علمبردار رسائل میں لکھتا جو بعد میں اللہ نے پوری کر دی۔ بعد ازاں وہ بھی موقع ملا کہ ان تینوں ادبی رسائل میں تین چار سال تک باقاعدگی سے مضامین تحریر کرتا رہا۔ لندن سے چھپنے والے ہفتہ وار ''نوائے جنگ'' میں پانچ سال کالم اور اداریے چھپتے رہے جن میں تنقیدی پہلو نمایاں ہوتا۔

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے میں قارئین کو تفصیل سے بتائیے؟

فقیر اللہ خاں: ادبی ماہناموں میں لکھنے کے بعد میری پہلی کتاب ''امریکہ جیسے میں نے دیکھا'' 2012ء میں طبع ہوئی۔ پھر دوسری کتاب مختلف اسفار پر مبنی ''سیر جہاں'' شائع ہوئی جس کا بیک فلیپ ڈاکٹر سلیم اختر نے تحریر کیا۔ تیسری کتاب ''المدینہ'' شائع ہوئی جسے متعدد علمائے دین نے بہت سراہا۔ یہ کتاب تقریباً 600 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد علماء کے کہنے پر ''المکۃ المکرّمہ'' تحریر کی جسے اس دھرتی کی ابتدا یعنی اللہ کے گھر کی تخلیق سے شروع کیا۔ خانہ کعبہ اور اس کے اردگرد مقامات مقدسہ پر سیر حاصل روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

میری کتاب ''دنیا کی 100 خوبصورت مساجد'' 2017ء میں 'دارالسلام' سے شائع ہوئی جو ساری آفسٹ کاغذ پر چھپی۔ اس کے تقریباً 340 صفحات اور دنیا کی خوبصورت 100 مساجد کی تقریباً چار سو تصاویر ہیں۔ یہ کتاب میری زندگی کا حاصل ہے۔ اس کتاب کو ہر طبقہ کے قاری نے بہت پسند کیا۔ اردو کے ممتاز محقق، سفرنامہ نگار، ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اس کی اپنے خوبصورت الفاظ میں بہت پذیرائی کی۔ یہاں تک کہ یہ کتاب فخر پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے ہاتھوں میں بھی پہنچی اور یہ اُن کی ذاتی لائبریری کی زینت ہے۔ اس پر اس ناچیز کو بہت فخر ہے۔

بعد ازاں زندگی کی کچھ بھولی بسری یادوں کو ''یادوں کے جزیرے'' کی صورت میں کتابی شکل دی۔ اس کے بعد ''یہ ہے لندن'' اسی سال کے آغاز میں ملک کے ممتاز ادبی ادارے ''نستعلیق'' سے شائع ہوئی۔ ''یہ ہے لندن'' ایک طرح سے لندن شہر کا مختصر انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں ہر طرح کی معلومات کو ایک کتاب کی شکل میں ڈھالا گیا ہے۔ اس کتاب میں لندن شہر کا کوئی ایسا کونہ نہیں جسے یہ ناچیز احاطہ تحریر میں نہ لایا ہو۔

ارژنگ: آپ کے نزدیک کامیاب سفرنامہ کی کیا تعریف ہے؟ سفرنامہ نگاری میں آپ کن کن باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں؟

فقیر اللہ خاں: ایک کامیاب سفرنامہ تحریر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ مصنف کو سفر کے دوران جن نظاروں اور عمارات نے متاثر کیا ہے، اُن کو من و عن احاطہ تحریر میں لایا جائے تاکہ قاری بھی تخیلاتی ماحول میں اُن مشاہدات اور قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہو سکے۔ کوشش ہونی چاہیے کہ قارئین سے سفر کے دلچسپ خدوخال کو مخفی نہ رکھا جائے تاکہ قاری روحانی طور پر اپنے آپ کو مصنف کے ہمراہ پائے۔ یہ مصنف کی مہارت پر منحصر ہے کہ وہ اپنی آنکھ سے دیکھے ہوئے نظاروں کو کس طرح صفحہ قرطاس پر منعکس کرتا ہے۔

ارژنگ: آپ نے بہت سارے ممالک کا سفر کیا۔ کس ملک کی تہذیب و ثقافت نے آپ کو زیادہ متاثر کیا اور کیوں؟

فقیر اللہ خاں: میں نے جتنے بھی ممالک کا سفر کیا ان میں سنگاپور، ملائیشیا، ازبکستان (تاشقند)، سپین (بارسلونا) اور جرمنی نے بہت متاثر کیا۔ سنگاپور دیکھنے میں تو ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے لیکن وہاں کی صفائی نے بہت متاثر کیا۔ آپ ماچس کی تیلی، سگریٹ کا ٹکڑا بھی زمین پر نہیں پھینک سکتے۔ خلاف ورزی پر 500 ڈالر

جرمانہ ہے۔ یہاں تک کہ سادہ پانی بھی سڑک پر نہیں پھینک سکتے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال ملائیشیا اور جاپان میں دیکھنے کو ملی۔

ازبکستان کے شہر تاشقند میں عرصہ 6 سال بطور منیجر پی آئی اے تعینات رہا۔ تاشقند کے علاوہ دوسرے شہر سمرقند، بخارا، خیوہ اور بابر کا شہر فرغانہ سب تاریخی شہر ہیں۔ اردو ادب کے تابناک ستارے غالب کے آباؤ اجداد بھی اسی خطہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سبزہ اتنا کہ دن کو شام کا سماں نظر آئے۔ ہم نے برفباری کے دوران عید کی نمازیں ادا کیں۔ سمرقند اور تاشقند کے نان اور خوشبودار شاشلک بہت شہرت رکھتے ہیں۔

ازبکستان میں دوران قیام کئی دفعہ سمرقند میں حضرت امام بخاریؒ کے مزار پر حاضری دی۔ سمرقند میں ایک ایسا قبرستان ہے جس میں صرف وہ مسلمان مدفون ہوتے جن کا نام محمدؐ سے شروع ہوتا۔ اس میں تقریباً 400 حفاظِ قرآن بھی محوخواب ہیں۔

سمرقند تو امیر تیمور کا شہر ہے۔ یہیں سے اُٹھ کر مشرق و مغرب کو تہہ و بالا کیا۔ اس کا اس کی بیگم اور پوتے الغ بیگ کا مزار بھی سمرقند ہی میں ہے۔ امیر تیمور خود حافظ قرآن تھا اور علماء و مشائخ کی قدر کرتا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں شاہراہ ریشم گزر کر چین کی سرحد اُرمچی تک جاتی۔ جس پر دن رات تجارتی قافلے رواں دواں رہتے۔ ناچیز نے شاہراہِ ریشم پر اپنی کتاب 'سیر جہاں' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کے علاوہ ازبکستان کے مرد و خواتین خواہ وہ امیر ہوں یا غریب نہایت خوبصورت لباس زیب تن کرتے ہیں۔ لباس سے کسی میں غربت و امارت کی جھلک نظر نہیں آتی۔ ازبکستان میں انتہائی شیریں اور لذیذ فروٹ دستیاب ہے۔ سرفہرست وہاں کا انگور، سیب، آڑو، کشمش بادام، اخروٹ، خوبانی، چیری اور سٹرابیری کی لذت بے مثال ہے۔ مجھے امریکہ میں اتنا لذیذ فروٹ کہیں نظر نہیں آیا۔ دریاؤں، باغات اور پارکوں کی کثرت ہے۔ سرسبز پہاڑوں کی خوبصورتی کا جواب نہیں جو موسم سرما میں برف کی سفید چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ موسم گرما میں کئی دفعہ پکنک پارٹی ترتیب دی جاتی۔ وہاں پر مارکیٹ میں دُنبے کا گوشت وافر مقدار میں دستیاب ہے، جو کہ پکانے میں بہت مزیدار بنتا ہے۔

ارژنگ: آپ کی ایک مشہور اور Best Seller کتاب ''دنیا کی سو خوبصورت مساجد'' ہے۔ قارئین کو بتایئے اس ریسرچ کا محرک کیا تھا؟

فقیر اللہ خان: واقعی میری تمام کتاب میں ''دنیا کی سو خوبصورت مساجد'' ہر مکتبہ فکر میں کافی مقبول ہوئی اور قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ کتاب تقریباً 340 صفحات پر مشتمل ہے اور مشہور اشاعتی ادارے 'دارالسلام' والوں نے اپنی دوسری مطبوعات کی طرح بیروت سے چھپوایا۔ اس کتاب میں تقریباً سو مساجد کی 400 خوبصورت تصاویر ہیں اور ساتھ ساتھ مساجد کے مکمل تعارف کے علاوہ اس متعلقہ ممالک کا معلوماتی خاکہ بھی تحریر ہے۔

دراصل اس کتاب کے تحریر کرنے کا محرک کچھ اس طرح ہے کہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کی طرف سے پیغام ملا کہ جلد از جلد کسی بھی موضوع پر مضمون تحریر کر کے ارسال کریں۔ میں نے دنیا کی چند خوبصورت مساجد کے عنوان سے آٹھ مساجد کا انتخاب کیا اور ارسال کر دیا۔ اگلے ماہ مضمون چھپ گیا۔ مضمون چھپنے کے بعد قارئین کی طرف سے غیر متوقع پذیرائی ملی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے تعریفی جملوں سے نوازا۔ اس سے مجھے حوصلہ افزائی ملی اور سوچا کہ کیوں نہ دنیا کی 100 خوبصورت مساجد کا انتخاب کر کے اس پروجیکٹ پر کام کروں۔ پھر میں نے دن رات ایک کر دیا اور باحسن وخوبی سے یہ کام مکمل کر لیا۔ جب مسودہ تیار ہو گیا تو اسے طبع کروانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اتفاق سے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اُن ہی کی وساطت سے یہ مسودہ 'دارالسلام' والوں کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے اسے شائع کروانے کی حامی بھر لی اور اس طرح یہ کتاب منظر عام پر آئی۔

ارژنگ: مکہ اور مدینہ پر لکھی گئی آپ کی کتب کے بارے میں قارئین کو تفصیل سے بتایئے۔

فقیر اللہ خان: پہلے میری کتاب 'المدینہ' شائع ہوئی اور 'المکۃ المکرمہ' بعد میں۔ المدینہ تحریر کرنے کا محرک کچھ اس طرح ہے کہ مدینہ شہر کا تعارفی خاکہ کہیں نظر سے گزرا۔ وہ بہت عرصہ میرے پاس محفوظ رہا۔ بعدازاں میں نے مدینہ شہر کا مکمل احاطہ کرنے والی کتاب کو عملی شکل میں لانے کا قصد کیا۔ اللہ نے میری مدد کی۔ میں نے اس کتاب کا آغاز جناب نبی کریم ﷺ کی ہجرت سے کیا اور حیات نبویؐ مدینہ، آپ ﷺ کی ازواج مطہرات، اولاد، آپ کی والدہ کی مدینہ کے قریب وفات، اصحاب عشرہ مبشرہؓ کے علاوہ ستر اسی صحابہ کرام، اصحابیاتِ رسولؐ، اصحاب صفہ، جنت البقیع، سلطان نور الدین زنگی کا مشہور واقعہ، ریاض الجنہ، روضۂ رسولؐ، مدینہ کی مساجد، غزوات، مدینہ کے پہاڑ، کنویں، مدینہ کی وادیاں اور قرآن پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ کی کھجوروں کی مکمل اقسام، غرضیکہ ان سب موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس طرح یہ کتاب مکمل ہوئی۔

'المدینہ' کے شائع ہونے کے بعد اکثر علمائے دین نے اس کاوش کو بہت سراہا اور دعاؤں سے نوازا۔ انہوں نے اسی طرح مکۃ المکرمہ پر قلم اُٹھانے کا مشورہ دیا۔ ان کے مشورہ کے مطابق پھر میں نے 'المکۃ المکرمہ' تحریر کی۔ خانہ کعبہ کی تعمیر، حجر اسود، مقامِ ابراہیم، آب زم زم، حطیم، مطاف کے علاوہ مسجد نمرہ، غار ثور، غار حرا، میدانِ عرفات، مزدلفہ، منیٰ مکہ کا قبرستان جنت المعلیٰ اور نہر زبیدہ کا تفصیل سے ذکر کیا اور تفصیل بھی اتنی جو اور کہیں آپ کو کم ہی نظر آئے گی۔ اس کتاب کو کئی لوگ ان مقامات مقدسہ کی زیارت کے سفر میں ہمراہ بھی لے جاتے ہیں۔ یہ

دونوں کتب مکتبہ اسلامیہ نے شائع کیں۔

کتاب 'المدینہ' کے باب جنت البقیع میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ:

''یہاں پر آسمان دنیا کے وہ ستارے آسودۂ خاک ہیں جو عہد رسالت میں اپنی تجلیاں دکھا کر زیر زمیں چلے گئے۔ یہاں پر ادب کے وہ مہ پارے مدفون ہیں جنہوں نے دنیا کے بے ادبوں کو ادب کرنا سکھایا۔ یہاں وہ ہستیاں جو محو خواب ہیں جن کے پاؤں کی خاک کے ذرّے آفتاب و ماہتاب سے زیادہ روشن ہیں۔''

ارژنگ: اردو ادب کی ترویج کے لیے قائم حکومتی اداروں کی کارکردگی سے آپ کتنے مطمئن ہیں؟

فقیر اللہ خاں: اردو ادب کی ترقی اور ترویج کے بارے آپ نے دریافت کیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ملک میں حکومتی سطح اور غیر حکومتی سطح پر ادارے فعال تھے۔ اب وہ سرگرمیاں کم کم ہی نظر آتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو، دارالمصنفین، انجمن فروغ اردو، اردو سائنس بورڈ، مقتدرہ قومی زبان، رائٹرز گلڈ جیسے ادارے فعال ہوا کرتے تھے۔ گاہے بگاہے ریڈیو، ٹی وی پر مباحثوں اور مشاعروں کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ شہروں کے گلی محلوں میں بھی محافل مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اب پتہ نہیں وہ رونقیں اور ادبی سرگرمیاں کہاں چلی گئیں۔ اردو ادب کی ترقی کے رکھوالے جب آہستہ آہستہ دنیا سے اُٹھتے گئے تو ان کی جگہ ویراں نظر آنے لگی ہے۔ وہ جگہ اب جدید دور کی صنعت آئی ٹی اور کمپیوٹر نے لے لی ہے۔

ایک عدالتی حکم نامے میں اردو کی ترویج کے لیے سرکاری دفاتر میں قومی زبان کو فروغ دینے کی ترغیب دی گئی لیکن ہم ہیں کہ ابھی تک قومی زبان کی بجائے دساوری زبان کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ پہلے مائیں اپنے بچوں کو اپنی اپنی مادری زبان کی بجائے اردو میں بات کرنے کو ترویج دیتی تھیں اب والدین کو خود انگلش آئے نہ آئے کہا جاتا ہے کہ انگلش میں بات کریں۔ اس پر ہمیں فخر نہیں بلکہ شرمندہ ہونا چاہیے۔

اب نہ وہ اتنے مشاعرے نظر آتے ہیں اور نہ اردو ادب کی داوں کو گرمانے والی محفلیں! معلوم نہیں یہ میری کم علمی ہے یا حقیقت۔ کیونکہ میں خود اپنے ملک سے ہزاروں کوسوں میل دور بیٹھا ہوا ہوں۔ ان باتوں میں کتنی صداقت ہے؟

ارژنگ: پاکستان سے باہر کتاب کا کیا مستقبل دیکھ رہے ہیں؟ کیا سوشل میڈیا نے ہر جگہ پرنٹ میڈیا کو متاثر کیا ہے؟

فقیر اللہ خاں: دراصل ایک انسان کے پاس 24 گھنٹے ہیں۔ اس نے اس میں سونا بھی ہے، کام بھی کرنا ہے، اسی فیملی کو وقت بھی دینا ہے اور باقی وقت سوشل میڈیا کی نذر ہو جاتا ہے۔ پرنٹ میڈیا کے لیے شاید ہی کسی کے پاس وقت بچے۔ بڑے لوگوں نے اپنی اپنی ذاتی لائبریریاں سجا رکھی ہیں، جن میں کئی نایاب اور ضخیم کتب بھی لائبریری کی زینت ہوتی ہیں۔ ان میں کتنے ہیں جو ان کتب کی گرد جھاڑ کر پڑھتے بھی ہوں گے۔ شاید خال خال۔ پہلے تو ہاتھ میں کتب اور رسالے ہوتے تھے اب انہیں ہاتھوں میں موبائل نے جگہ لے لی ہے۔

ارژنگ: آپ کے پسندیدہ سفرنامہ نگار کون ہیں؟ موجودہ دور میں کون اچھے سفرنامے لکھ رہا ہے؟

فقیر اللہ خاں: مصروف ملازمت کے سلسلہ میں ایک طویل عرصہ بیرونِ ملک ہونے کی وجہ سے کسی کو بھی پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اسے آپ میری کوتاہی سمجھ لیں یا کچھ اور۔ میں نے اپنے سفرناموں میں اپنا ایک خاص اسلوب اپنایا ہے۔ ان میں سیر کے ساتھ ساتھ حقائق اور ہندسوں کو اُجاگر کیا ہے۔ ساتھ ساتھ تاریخ کے ابواب کو بھی اپنے مضامین کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ قاری کسی قسم کی تشنگی محسوس نہ کرے۔ اس میں میری سرچ کا عمل دخل ہے۔

ارژنگ: ایک مثالی تخلیق کار میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟

فقیر اللہ خاں: ایک مثالی تخلیق کار کو قارئین کی خواہشات اور جستجو مدنظر رکھنی چاہیے جو ان کے علم میں اضافہ کا سبب بنے۔ مصنف کو اپنے عنوان کی حدود کے اندر کا مضمون کو احاطہ تحریر میں لانا چاہیے۔ آلتو فالتو اور موضوع سے ہٹ کر باتوں کو تحریر میں لانے سے گریز کرنا چاہیے۔

ارژنگ: زیرِ تصنیف کتب کے بارے میں بتائیں؟

فقیر اللہ خاں: مزید زیرِ تصنیف کتب کے بارے میں فی الحال 'خاموشی' اختیار کی ہوئی ہے۔ اس میں موجودہ ملازمت کا بڑا 'ہاتھ' ہے۔ وہ اس طرح کہ ''کبھی وقت ملتا ہے تو فرصت نہیں ملتی، اگر فرصت مل جائے تو وقت نہیں ملات'' کے مصداق

ارژنگ: آپ کے نزدیک شاعری کی کیا اہمیت ہے؟

فقیر اللہ خاں: اردو ادب میں شاعری کا اپنا الگ مقام ہے۔ شاعری میں شاعر دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن جانتا ہے۔ کوئلے کی کانوں سے ہیروں کو دریافت کرنا اور ان کو خوبی سے تراشنا شاعری کا اوجِ کمال ہے۔ دراصل اردو ادب میں نثر اور شاعری کا مقابلہ کیا نہیں جا سکتا۔ دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔

ارژنگ: -

فقیر اللہ خاں: 2019ء میں نیو یارک میں قائم اردو کے شہرت یافتہ ٹی وی 'کاوش' میں ناچیز کا آدھ گھنٹہ کی انٹرویو ٹیلی کاسٹ ہوا، جو میری تصنیف کردہ کتب کے بارے میں تھا۔ اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی میں ایک سمپوزیم میری کتاب ''دنیا کی خوبصورت مساجد'' کے بارے میں منعقد ہوا۔ جسے میں نے بنک سے باہر ہونے کی وجہ سے یوٹیوب پر دیکھا۔ یوٹیوب کے چینل قانونی ٹی وی پر بھی انٹرویو نشر ہو چکا ہے۔

ارژنگ: قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

فقیر اللہ خاں: قارئین کے لیے پیغام یہ ہے کہ

باغِ ادب میں جو گلِ معنی کھلا کبھی
دامن میں رکھ لیا نظرِ انتخاب نے

اس شعر میں میری طرف سے پیغام واضح ہے۔

✦ ✦ ✦

شاعری

ردائوں سے ردائیں لے گئی ہیں
سمندر سے ہوائیں لے گئی ہیں
پڑی خطرے میں ان کی بادشاہی
خزانے داشتائیں لے گئی ہیں
تری موسیقیوں کی اُونچی تانیں
مری مدھم صدائیں لے گئی ہیں
شفا خانے میں بچے رو رہے ہیں
اُٹھا کر گھر کو مائیں لے گئی ہیں
جہاں میں ایسی شاخیں امن والی
چمن سے فاختائیں لے گئی ہیں
تری گلیوں میں کب آتا تھا ثاقب
وہاں اس کو وفائیں لے گئی ہیں

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

جو برگِ زرد ہیں، اُن کو ہرا کہا جائے
خزاں کے ہاتھ کو دستِ صبا کہا جائے
بخوبی جانتا ہوں میں سب اچھے لوگوں کو
میں چاہتا ہوں کہ مجھ کو بُرا کہا جائے
امیرِ شہر کا ہم سے یہی تقاضا ہے
شدید حبس کو تازہ ہوا کہا جائے
یہ لوگ قعرِ مذلت میں گرتے جاتے ہیں
اور اس پہ ضد کہ اسے ارتقا کہا جائے
کئی یزید یہاں دندناتے پھرتے ہیں
ہمارے شہر کو اب کربلا کہا جائے
وہ اقتدار کے نشے میں غرق ہے اتنا
یہ چاہتا ہے اُسے اب خدا کہا جائے
نسیم، ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ اب
جو اَب تک اُس سے نہ ہم نے کہا، کہا جائے

نسیم سحر/راولپنڈی

امکانات کی دُنیا

اِس کونے سے اُس کونے تک
پہلے قدم سے آخری تک
صبح سے لے کر رات تلک
یعنی آخری بات تلک
ایک کتاب کے پہلے ورق سے آخر تک
سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے مسافر تک
اِس دنیا سے اُس دنیا تک
سارا کھیل امکانی ہے
باقی ہر شے فانی ہے
امکانات پہ بحث کا دروازہ کُھلتا ہے
بات سے بات نکلتی ہے
جبکہ فتوے کا مطلب ہے تالا بندی
سوچ پہ پہرے، آزادیٔ رائے پر پابندی
مشکل ہوتا جاتا ہے ایسے ماحول میں جینا
گھٹ گھٹ کے زندہ رہنا اور زہر پیالہ پینا
دُھند میں لپٹا ہے جو رستا
وہ بھی تو امکانی ہے
آنکھوں میں جو خواب سجا ہے
وہ بھی تو امکانی ہے
چاک پہ گھومتی ہے جو مٹی
وہ بھی تو امکانی ہے
لفظ میں ہے جو جہانِ معنی
وہ بھی تو امکانی ہے
ابھی نظر سے ہے جو اوجھل
وہ بھی تو امکانی ہے
اِس کا مطلب ہے دنیا امکانی ہے
مہد سے لے کر لحد تلک حیرانی ہے
امکانات تغیر سے پیوستہ ہیں
ہر شے امکانات سے پھلتی پھولتی ہے
امکانات سے دنیا آگے بڑھتی ہے
زندگی امکانات کے بل پر چلتی ہے
زندگی فتوے پر ہوتی تو مَر جاتی
زندگی تو امکان پہ زندہ رہتی ہے

ظہور چوہان/بہاول پور

گنتی کا تصرف نہیں تعداد کے پیچھے
اک یاد چلی آتی ہے ہر یاد کے پیچھے
وہ دکھ جو کبھی جھیلے تھے ماں باپ نے میرے
اب جھیل رہا ہوں وہی اولاد کے پیچھے
اک خوف ہے دل میں جو نکلتا ہی نہیں ہے
خفتہ کوئی اُفتاد ہے اُفتاد کے پیچھے
تم پر نہ کھلے گی مرے آزار کی لذت
میں قید ہوا لمحۂ آزار کے پیچھے
ہے باعث رُسوائی مگر بات یہی ہے
بے چین ہے دل اک ستم ایجاد کے پیچھے
جو میرے علاوہ بھی نظر رکھتا ہے اُس پر
پھرتا ہے کوئی اور بھی ہمزاد کے پیچھے
دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے جو گھروں کو
آسیب ہے ایسا کوئی بنیاد کے پیچھے
کیا جملہ تحسین دکھائے گا کرامات
آتا ہے کہاں حرف ہنر داد کے پیچھے

جنید آزر/اسلام آباد

تجسس میں ہے جام اَپنا، یہ بھرتا بھی مگر کیسے؟
شرابِ خود شناسی سے، شعورِ ذات کی مے سے
شکایت ہم نے کی اتنی کہ دنیا دور لگتی ہے
رکھا نہ ہاتھ آنکھوں پر، کہا، دیکھو! مگر ایسے

اُسے آواز کیا دیتیں رموزِ خود شناسی بھی
جو واقف ہی نہیں اب تک دلِ بے خود کی اک نے سے
عطائے ربِ اکرم ہے قلم کا ہاتھ میں آنا
اسے ممتاز رکھیں گے زمانے بھر کی ہر شے سے
کلیدِ قفلِ ذات اپنی لیے پھرتے ہیں باتوں میں
زمانے بھر کی نظروں سے کوئی چھپتا نہیں ویسے
دلِ خودسر کا کیا کہنا کبھی بسملؔ کا پوچھو تو
تکلف اس قدر برتے کہ واقف ہی نہیں جیسے

عبدالوحید بسملؔ/ایبٹ آباد

جب کبھی غور سے رُخ چلتی ہوا کا دیکھا
اپنی ہی خاک پریشاں کا تماشا دیکھا
بولتا کوئی نہیں کس نے کہاں کیا دیکھا
یوں تو افلاک پہ رکھا تھا قدم پہلی بار
ہر ستارہ نظر آتا رہا دیکھا دیکھا
دل نے اک لہر کی آواز پہ لبیک کہا
ناؤ دیکھی، نہ سمندر نہ کنارہ دیکھا
ہم تو دنیا میں جہاں ٹھہرے جدھر سے گزرے
اجنبی ہی کوئی پایا نہ شناسا دیکھا
کوئی حاضر ہو کہ غائب ہو عیاں ہو کہ نہاں
ہم نے جس جس کو جہاں دیکھنا چاہا دیکھا
شعر میں گوندھ لیا اُس کے خط و خال کا رنگ
طنطنہ جس میں بھی غالبؔ کی غزل سا دیکھا
کوئی آہٹ کوئی آواز نہیں تھی لیکن
چُپ کے پردے میں چھپا شور بلا کا دیکھا

سیّد انصر/کھاریاں

میرے ہوتے نہ کسی آنکھ میں آئے پانی
جتنا آتا ہے مری آنکھ میں آئے پانی
جب مرا خواب سنا مجھ سے کہا پتھر نے
جا مرے دوست تری آنکھ میں آئے پانی
آپ کہہ دیں تو مری آنکھ سے سورج نکلے
آپ کہہ دیں تو ابھی آنکھ میں آئے پانی
کل کسی اور طرف جائے تو جائے لیکن
آج آئے تو اسی آنکھ میں آئے پانی
وہ بھی کیا لوگ زمانے میں ابھی زندہ ہیں
جن کو حسرت ہی رہی آنکھ میں آئے پانی
سر جھکائے کوئی آتا ہے چلا جاتا ہے
جیسے خوابوں سے جڑی آنکھ میں آئے پانی
یہ مرا دل تو عدیمؔ ایسی سرائے ہے جہاں
وہ کبھی آئے کبھی آنکھ میں آئے پانی

ندیم اجمل/برطانیہ

ہمیں وفا کا صلہ ملا یہ، ہمارے سر پر قضا کھڑی ہے
تمہاری خاطر سہیں گے ہنس کر، فراق کی یہ سزا کڑی ہے
اداس لمحوں کی بیتی باتیں جو سن سکو تو سنائیں تم کو
ہماری سنتے نہیں ہیں اپنے، ہو غیر تم، تم کو کیا پڑی ہے
ہمارے دل پر یہ اب کے کیسی بہار آئی ہے، دیکھ لو تم
اُداس دل ہے، جگر ہے چھلنی تو فصلِ بے چارگی کھڑی ہے
تمہاری خاطر ورق یہ سارے سنبھال رکھے ہیں ہم نے جاناں
جو ہو سکے سارے باب پڑھنا، کتابِ دل اب کھلی پڑی ہے
سو، جن کی خاطر یہ دکھ ہیں جھیلے، بری نظر سے بچا کے رکھا
وہ چاند چہرے بچھڑ رہے ہیں، دعا کرو یہ کٹھن گھڑی ہے
انا کے اپنے بتوں کو توڑا، روایتوں کا بھی سر کیا خم
مگر وہ ان کی انا ابھی تک جہاں جڑی تھی، وہیں جڑی ہے
نوازیں جن کو کریں وہ محروم یہ تو دنیا کی ریت ٹھہری
خدا سے مانگیں گے آرزوؔ ہم، خدا کی ہستی بہت بڑی ہے

خالق آرزوؔ/ساہیوال

کیا مقدر میں لکھا ہے، کیا دیکھنا
جو بھی لکھا ہے اس سے سوا دیکھنا
اپنے اندر ہمیں ہی ہمیں پاؤ گے
ہو جو فرصت کبھی، آئینہ دیکھنا
گر نہ چاہو تو پھر بھی کھنچے آؤ گے
ہاں محبت میں یہ مرتبہ دیکھنا
تم ہی روٹھے رہو، ہم مناتے رہیں
کب تلک یہ چلے سلسلہ، دیکھنا
تم جفا کرتے کرتے ہی تھک جاؤ گے
ہم کریں گے نہ تم سے گلہ، دیکھنا
بس ہمارا ہی دل تم سمجھنا اسے
جب کہیں بھی کوئی در کھلا دیکھنا
مثل میری نہ ٹھوکر لگانا اسے
کوئی پتھر جو رہ میں پڑا دیکھنا
منزلِ شب کا تنہا مسافر ہوں میں
کیسے پاتا ہوں روشن ضیا دیکھنا
دل سے نکلی ہوئی آرزو تھی مری
عرش تک بن گئی ہے دعا، دیکھنا

خالق آرزوؔ/ساہیوال

''نہ جانے رُت کا تصرف تھا یا نظر کا فریب''
کہ دائروں میں چلاتا رہا سفر کا فریب
سرابِ شب میں بڑھی تشنگی مرے دل کی
مٹا سکا نہ کبھی تیرگی سحر کا فریب
محبتوں کی زمیں پر ہے زندگی کا علم
چراغِ راہ مسافر سفر حضر کا فریب
کسی کے لب کی نمی سے کرن جو ٹکرائی
نگہ کو دینے لگی شعلہ و شرر کا فریب
جو منتظر تھا وہی منتظر بھی پایا ہے
حجاب تھا تو فقط زیر یا زبر کا فریب
مرے جنوں نے تجھے بخش دی پذیرائی
کہاں کا حسن ترا کیا کسی اثر کا فریب
ندیم جانِ ظہیرؔ اُس کو میں سمجھتا ہوں
سکون دینے لگا چشمِ بے بصر کا فریب

ظہیر مہروی

ٹوٹے خوابوں کی اذیت کو لیے بیٹھے ہیں
جانے کیوں لوگ محبت کو لیے بیٹھے ہیں
چھوڑ کر دنیا کی رنگینیاں اک کونے میں
بس تری یاد کی وحشت کو لیے بیٹھے ہیں
ہم مروت کے امیں اور محبت کے سفیر
اپنے اجداد کی عزت کو لیے بیٹھے ہیں
ایک دنیا ہے کہ ڈالے ہے ستاروں پہ کمند
ایک ہم ہیں ابھی غربت کو لیے بیٹھے ہیں
جھوٹ کے جبر کے بازار میں اب بھی کچھ لوگ
سچ کی بے کار حقیقت کو لیے بیٹھے ہیں
کون سمجھائے انہیں پیار کا مطلب عنبر
یہ جو نادان عداوت کو لیے بیٹھے ہیں

فرحانہ عنبر/گوجرانوالہ

سامنے ہے سراب صدیوں کا
کون دے گا حساب صدیوں کا
ہم کو درکار ہے وہی لمحہ
جو الٹ دے نقاب صدیوں کا
چند لمحوں کی کم نگاہی سے
ہم نے جھیلا عذاب صدیوں کا
دے کے لمحات چند لمحوں کے
مانگتا ہے حساب صدیوں کا
ہم کو رکھتا ہے بے سکون ساحل
یہ گناہ و ثواب صدیوں کا

ساحل منیر/میاں چنوں

غم دنیا کے ماروں پر ذرا ماتم کیا جائے
چلو ہم بے سہاروں پر ذرا ماتم کیا جائے
جہاں ہر گام پر مقتل سجے ہیں بے زبانی کے
کبھی ان رہگذاروں پر ذرا ماتم کیا جائے
رہی ہر شاخ بے برگ و ثمر جن کے نصیبوں کی
انہی اجڑی بہاروں پر ذرا ماتم کیا جائے
نگلنے آئے ہیں اب کے اندھیرے اس تمدن کے
میرے ان مہ پاروں پر ذرا ماتم کیا جائے
ڈبو آئے ہیں جن کو ناخدا ان کے لیے ساحل
کھڑے ہو کر کناروں پر ذرا ماتم کیا جائے

ساحل منیر/میاں چنوں

کچھ تو ایسا بھی ہو برائے دل
یعنی جس سے کہ دل لگائے دل
جو بھی گزرے ہے، دل پہ گزرے ہے
جو بھی آئے ہے، آزمائے دل
ایک خالی مکان میں تنہا
کیسے رہتا ہے تو خدائے دل
دل کو ملتی ہے ایک راحت سی
شام چلتی ہے جو ہوائے دل
جانے کس کیفیت سے گزرا ہوں
آنکھ روتی ہے، مسکرائے دل
تجھ کو میں بھول جانے والا ہوں
دیر اتنی ہے مان جائے دل
تو ہی سننے سے دیپ قاصر ہے
عرش تک جاتی ہے ندائے دل

مجتبیٰ شہزاد دیپ/جھنگ

ہاتھ دیے کی لو پہ رکھے، ہم نے رات بتائی ہے
جانے کیسی وحشت ہے جو من میں آن سمائی ہے
ہم نے ہر اک رنگ میں ڈھل کر روپ بدل کر دیکھا ہے
لیکن وہ کچھ اور طرح کے چہروں کا شیدائی ہے
تیری یاد نے چپکے چپکے کانوں میں سرگوشی کی
تیری خوشبو دروازے پہ دستک دینے آئی ہے
اپنے آپ سے باتیں کرتے رہنا ایک اذیت ہے
اور ہم نے اس ڈھیر اذیت میں یہ عمر گنوائی ہے
خالی گھر کے آنگن میں اک خاموشی کا پہرا ہے
ایک عجیب سی وحشت ہے اک لایعنی تنہائی ہے

حنا کوثر/منڈی بہاؤالدین

اجنبی دیسوں میں ہم گھوما کریں
منظروں کو دیر تک دیکھا کریں
جستجو رکھتی ہے جن کو در بدر
ہم بھی ایسے لوگوں میں بیٹھا کریں
جن میں سب کچھ ہو مگر حسرت نہ ہو
ایسے بازاروں سے ہم گزرا کریں
خواب جیسی وادیاں ہوں دور تک
بادلوں کے ساتھ ہم بھاگا کریں
جنگلوں میں ڈھونڈیں برگد کے درخت
ان کے نیچے بیٹھ کر سوچا کریں
اک جزیرہ، رات، ساحل، چاندنی
لہروں کے ہم شور میں سویا کریں
چاندنی کے ڈول بھر کر ناؤ سے
شب کی گہری جھیل میں ڈالا کریں
جانے والے ہو گئے پتھر جہاں
ان گلی کوچوں میں ہم جھانکا کریں
کمرے کی کھڑکی سے دیکھیں چاند کو
نیند آئے اور ہم جاگا کریں
بے وقوفی کی کریں باتیں کبھی
قہقہوں میں اپنے دکھ بھولا کریں
سارے افسانے مکمل ہو گئے
ان کے عنوانات کا اب کیا کریں
چہرے پڑھ کر دن گزاریں اور حسن
رات کو ہم ڈائری لکھا کریں

حسن عباسی/لاہور

سفرنامہ

قانون کی حکمرانی ہی واحد فرق ہے

عابد حسین قریشی/لاہور

اس سال کے شروع میں چند دنوں تک پہلی مرتبہ دوبئی کی سیر کا موقع ملا۔ دوبئی دیکھنے کے بعد سب سے پہلا تاثر تو یہ ابھرا، کہ بہت دیر سے دنیا کا یہ عجوبہ شہر دیکھنے آئے ہیں، وہ بھی فیملی کے ساتھ۔ ہر قدم پر یہ افسوس یا پچھتاوا حاوی رہا، اس شہر کو شاید جوانی میں دیکھنے کا لطف کچھ مزید دوبالا ہوتا۔ بہرحال اس ہلکے پھلکے تبصرہ کے بعد اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ جس طرح دوبئی کو تاخیر سے دیکھنے کا قلق رہا، اسی طرح اس ملک نما شہر میں گھومتے ہر قدم پر ایک احساس ندامت رہا، کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، اور ہم نے ایک بہت وسیع وعریض وسائل اور نعمتوں سے مالا مال پاکستان کا کیا حشر کر دیا ہے۔ اور یہ احساس ندامت دوبئی ایئرپورٹ کے مین ٹرمینل پر اترتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ کیا سٹیٹ آف دی آرٹ ایئر پورٹ ہے۔ ایک پوائنٹ سے دوسرے تک پہنچنے کے لیے ٹرین کئی کئی منٹ تک چل رہی ہے۔ مسافروں کا جم غفیر ہے۔ بیک وقت چالیس پچاس فلائٹس کا چیک ان جاری ہے، مگر مکمل ڈسپلن کے ساتھ۔ رش ہے، مگر ہڑبونگ نہیں۔ رن وے پر جہاز لاری اڈا پر بسوں کی طرح قطار اندر قطار کھڑے ہیں۔ اتفاق سے ہمارا قیام ایئرپورٹ کے نزدیکی علاقہ کے ایک اچھے ہوٹل میں تھا۔ میں صبح ناشتہ کے بعد ہوٹل کی چھت پر بنے سوئمنگ پول کے پاس کوئی بیس منٹ تک بیٹھا، رن وے بالکل سامنے تھا، اور اس دوران تقریباً بیس پچیس کے قریب جہازوں نے دوبئی ایئرپورٹ سے اڑان بھری۔ اتنے ہی پیچھے تیار نظر آ رہے تھے، تو اپنا لاہور ائیرپورٹ یاد آیا کہ وہاں اگر دو اکٹھے جہاز اتر جائیں تو ہنگامہ مچ جاتا ہے، اور اگر تین آ جائیں تو شاید ایمرجنسی کی صورت حال بن جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں دوبئی سے فلائٹس نہ جاتی ہوں۔ دوبئی کی کامیابی کا پہلا راز تو یہی ہے۔ کسی زمانہ میں کراچی ایئر پورٹ transit کے لیے اس پورے خطے میں واحد بہترین مقام تھا۔ پھر ہم نے پہلے اسے سیاست کی نظر کیا، پھر خون ریزی اور لوٹ مار کے، لوگ کراچی سے بچنے لگے اور ہم نے ایک بہت بڑے تجارتی اور ثقافتی مرکز کو اپنے ہاتھوں برباد کر دیا۔ دوبئی نے کراچی کو بڑی مہارت سے replace کر دیا۔

دوبئی شہر کی خوبصورتی، تعمیراتی حسن، بڑی کھلی اور خوبصورت شاہراہیں، بڑی منظم ٹریفک، بڑے بڑے عالی شان شاپنگ مالز، ناقابل یقین بلند و بالا عمارتیں، سمندر کو تجارتی اور شہر کے حسن میں اضافہ کے لیے بہترین استعمال، سمندر کے اندر اور اطراف میں پھیلے سامان تعیش سے مزین مہنگے ترین ہوٹل، مذہبی آزادی اور رواداری، سب اپنی جگہ قابل ذکر، قابل تعریف اور لائق ستائش و تحسین ہیں، مگر جو بات بلکہ اصل راز اسکی ترقی کا ہے، وہ اس شہر میں قانون کی حکمرانی کا ہے۔ قانون کی حکمرانی یا رول آف لاء کے جو مظاہر دوبئی میں نظر آتے ہیں، وہی اس شہر کی یا دنیا کے اس سب سے بڑے ٹورسٹ سپاٹ کی وجہ شہرت ہے۔ سڑکوں پر بظاہر کوئی پولیس نظر نہیں آ رہی، مگر ہر شخص قانون کی پاسداری پورے خوف اور اعتماد سے کر رہا ہے۔ رات گئے ہم دوبئی کے سب سے پوش ایریا برج خلیفہ کے قریب ایک سڑک کنارے اپنی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ نہایت مختصر لباس میں، جسے پاکستانی زبان میں قابل اعتراض کہا جاتا ہے نوجوان دوشیزائیں جن کا مختلف ملکوں خصوصاً یورپ، فار ایسٹ، انڈیا اور دیگر ممالک سے نظر آتا تھا آ جا رہی ہیں، کچھ ہوش میں اور کچھ نیم مدہوش، مگر کسی کی جرأت نہیں کہ کوئی آوازہ کسے، کوئی بیہودہ فقرہ بولے۔ کوئی لفٹ دینے کی کوشش کرے۔ ٹریفک کی جتنی پابندی دوبئی میں دیکھی شاید ہی کسی ملک میں ہو۔ ہر ٹیکسی ڈرائیور پر ہمہ وقت ایک انجانا خوف ٹریفک پولیس کا اور چالان کے ٹکٹ کا چھایا ہوا ہے۔ شاپنگ مالز کے اندر لگتا ہے کہ ساری دنیا سے لوگ ادھر اکٹھے ہو گئے ہیں، کندھے سے کندھا چھل رہا ہے، مگر لوگوں میں وقار ہے، شائستگی ہے، کوئی چھینا جھپٹی نہیں، کوئی دو نمبری کا احتمال نہیں۔ جہاں قطار کی ضرورت ہے، لوگ قطار میں ڈسپلن سے کھڑے ہیں۔ رات مرینا میں کروز کی سیر کے دوران دوبئی کا اصل cultural multi چہرہ نظر آیا۔ کوئی بندہ دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر رہا۔ کوئی کسی پر اپنا مسلک یا عقیدہ ٹھونپ نہیں رہا۔ ہر بندہ کو اپنے کام سے غرض ہے۔ یورپ اور امریکہ سے گورے یہاں ٹیکس فری نیٹ کا فائدہ لینے دوبئی سے کاروبار کر رہے ہیں، اور انہیں"" وہ سازگار ماحول اور سہولیات"" سب یہاں میسر ہیں جن کا تقاضا یا تمنا وہ اپنے ملکوں میں کر سکتے ہیں۔ کسی کو رات کی تنہائی میں لٹنے کا خوف نہیں، کسی کو "چھاپے کا ڈر نہیں"۔ کسی شہر کو دنیا کا جدید ترین اور کامیاب ترین ٹورسٹ سپاٹ بنانے کے لیے اور کیا درکار ہوتا ہے۔ پاکستانی، انڈین یا بنگالی جس سے بھی بات ہوئی، سبھی دوبئی کے سخت قوانین کی تعریف اور ان کی پاسداری کرتے نظر آئے۔ تو گویا کسی قوم کی ترقی کا راز اسکے پاس اسلحہ کے انبار سے، اسکی پھلتی پھولتی معیشت سے، اسکی مین پاور سے، اسکی علاقائی یا جغرافیائی location سے، یا اسکے بڑا یا چھوٹا ملک ہونے میں نہیں ہوتا، بلکہ ترقی اور کامیابی کا راز اس ملک میں قانون کی حکمرانی سے ہوتا ہے۔ رول آف لاء کے یکساں اور transparent نفاذ سے ہوتا ہے۔ قانون کو موم کی ناک، اور غریب امیر کے لیے الگ الگ قانون رکھنے والے ملک ترقی نہیں کرتے بلکہ انارکی اور پسماندگی کا شکار رہتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی سے ہی خلیج کا یہ صحرا یا desert دنیا کا ماڈرن اور جدید ترین دوبئی بن کر ابھرتا ہے۔

شکستہ ظروف کا سنہرا سفر

عامر بن علی/ جاپان

صوفی درویش سے گھریلو خاتون خانگی مسائل پر گفتگو میں مگن تھی۔ اپنے خاوند سے اس عورت کو بہت ساری شکائتیں تھیں۔ کسی طور پر بھی وہ مصالحت پر آمادہ نہ تھی۔ بزرگ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ازدواجی رشتوں میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ ایک ساتھ پڑے برتن بھی ٹکرا جاتے ہیں۔ اپنا بستا ہوا گھر مت توڑو۔ خاوند کو معاف کر دو۔ مفاہمت و مصالحت سے کام لو۔ خاتون مگر غصے میں تھی۔ شوہر نے اس کا دل توڑا تھا، اس کا اعتماد مجروح کیا تھا۔ کہنے لگی شیشہ ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر نہیں جڑ سکتا۔ دل کے آئینے میں ایک بار بال آ جائے تو پھر وہ دور نہیں ہو سکتا۔ اس پر دانا بزرگ نے خاتون کو مثال دی کہ جاپان میں ٹوٹے ہوئے شیشوں کو جوڑنے کا ایک فن ہے۔ ٹوٹا ہوا کانچ کا برتن اور آئینے کو سونے، چاندی و دیگر قیمتی دھاتوں کو پگھلا کر جوڑا جاتا ہے۔ ٹوٹ کر جڑے ہوئے یہ برتن پہلے سے زیادہ قیمتی ہو جاتے ہیں۔ پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔

اس کہانی کا انجام تو الگ موضوع ہے مگر اسے سننے کے بعد میں جب بھی جاپان میں کہیں شیشے اور سرامک کے کسی ٹوٹے برتن کو سونے، چاندی، پلاٹینم سے جڑا ہوا دیکھتا ہوں تو ٹھٹھک جاتا ہوں۔ انسانی رشتوں کے ساتھ ان شکستہ برتنوں کی تشبیہ خوبصورت بات ہے۔ ان ٹوٹے ہوئے برتنوں کو جوڑنے اور قیمتی دھاتوں سے ان میں آئے بال کو پُر کرنے کا فن یہاں فنون لطیفہ میں شامل ہے۔ اسے ''کِھن سگی'' کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کی تشریح میں ہی ایک جہان آباد ہے۔ سنہری مستقبل، طلائی آئندہ، سنہری مرمت، طلائی جوڑ، سنہرا سفر بھی بڑا مناسب ترجمہ ہے۔ اس فن کے لئے ایک لفظ سونا بنانا بھی مستعمل ہے۔ صدیوں پرانا یہ فن فقط فنون لطیفہ کا حصہ نہیں بلکہ ایک گہرا فلسفۂ حیات ہے۔ یہ استعارہ بھی ہے ٹوٹے رشتوں کو جوڑنے اور انسان کو خوبیوں کے علاوہ نقائص سمیت قبول کرنے کا۔ اپنی ذات کی کجیاں، کمیاں، عیب قبول کرتے ہوئے جینے کا حوصلہ و ہنر۔ انسان فانی ہے، اور شکست کھا جاتا ہے، اس کے باوجود شخصیت کے عیب قبول کرتے ہوئے محبت کرنے والے کی صلاحیت اور رغبت۔ یہ موضوع اتنا وسیع مفہوم و معانی رکھتا ہے کہ اس پر بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

اردو شاعری کے توسط سے اس بابت جو ناقص معلومات ہم تک پہنچی ہیں، ان کا خلاصہ تو کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کیوں آس لگائے بیٹھے ہو

جن برتنوں سے خوبصورت یادیں وابستہ ہوں ان کے ٹوٹنے کا دکھ اس لئے بھی زیادہ ہوتا ہے کہ ان یادوں کے فراموش ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے شکستہ ظروف کے لئے ''کِھن سگی'' مسیحائی کا عمل ہے۔ ظروف کو ٹوٹنے کے بعد بھی قابل استعمال اور عزیز رکھنے کی خواہش جاپانیوں میں بہت قدیم ہے۔ اس کی جڑیں مذہبی و روحانی، سلسلے زن ZEN مسلک سے بھی منسلک ہیں۔ جس کے نزدیک بدصورتی اور بھدا پن بھی متاثر کن ہے۔ شکستہ ظروف میں خوبصورتی تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ دراڑیں برتن کو اور زیادہ قیمتی بنانے کا سبب بھی ہو سکتی ہیں۔ اس فن میں جدت اور خوبصورتی پیدا کرنے کا سبب پانچ صدیاں پہلے رونما ہونے والا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جب ایک ''شوگن'' نے اپنا چائے کا ٹوٹا ہوا پیالا مرمت کے لئے چین بھیجا۔

دھات کی دھاروں سے مرمت ہونے کے بعد جب یہ پیالا واپس جاپان پہنچا تو بہت بھدا لگ رہا تھا۔ ''شوگن'' کو بے حد مایوسی ہوئی۔ اب شوگن کیا ہوتا ہے؟ یہ ہزار کتابوں کا موضوع ہے۔ اس نام سے عالمی شہرت یافتہ ناول بھی موجود ہے۔ مگر اس وقت میں اس کا ترجمہ ''سورما'' کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ آپ صلیبی عہد کے نائٹ سمجھ لیجئے۔ اس واقعے نے جاپانی کاریگروں کو تحریک دی کہ کیسے شکستہ ظروف کی دراڑوں کو خوبصورتی کا پہلو مدنظر رکھتے ہوئے پُر کر کے انہیں دوبارہ قابل استعمال بنایا جائے۔ پانچ صدیوں کے ارتقاء کے بعد آج ہم اس فن کو بام عروج پر دیکھتے ہیں۔ ایک سے ایک جدید ورکشاپ ہے جو ٹوٹے ظروف کو طلائی جوڑ لگاتی ہے۔ اب تو اگر شکستہ جام وصراحی کا کوئی گمشدہ ٹکڑا بھی ہو تو جدید تکنیک کی مدد سے اسے بنا لیا جاتا ہے۔ کلی، لاک، لاکاسے سے یہ عموماً ٹکڑے بنتے ہیں۔ اہل پنجاب نے کسی زمانے میں گلی محلے میں یہ آواز ضرور سنی ہوگی۔

''پانڈے کلی کرالو''

جن لوگوں نے یہ آواز کوچہ و بازار میں نہیں سنی انہوں نے سریلے غزل گائیک مہدی حسن کا اس موضوع پر مشہور زمانہ گیت ضرور سن رکھا ہوگا۔ میرا مقصد ٹوٹے برتنوں کو قیمتی دھاتوں سے جوڑنے کا طریقہ بیان کر کے آپ کو بور کرنا نہیں ہے۔ غم، بیماری، کرب، حادثے اور دیگر اندوہناک واقعات کے بعد تعمیر نو کا حوصلہ اور خود کو نقصانات کے بعد بکھرنے سے بچانے کا یہ استعارہ ہے۔ مغربی جرائد نے کرونا نے بچھڑنے والوں کے کرب سے سمجھوتہ کر کے آگے بڑھنے کی ہمت کے باب میں بار بار ''کِھن سگی'' کی مثال دی ہے۔ ذہنی امراض کا شکار افراد بھی جب بحالی کا سفر شروع کرتے ہیں تو اہل مغرب انہیں اسی سنہری جوڑ کو علامت بناتے ہیں۔ یہ استعارہ انسانی زندگی، رشتوں اور دنیا کی بے ثباتی کے باوجود آگے بڑھنے کا ہے، یہ فقط ایک لطیف فن نہیں جوشِ نمو کے حوصلے کی تلمیح ہے۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں میں خوبصورتی تلاش کرنے کی ہمت و حوصلے کی علامت ہے۔

افسانہ

پری چہرہ......!

بشریٰ رحمٰن

ڈاکٹر صاحب وارڈ کے اندر آ کر گرجنے برسنے لگے......نرسوں کی اور عملے کی دوڑ لگ گئی۔ ایک نرس دوڑ کر مریضہ کے کمرے میں آئی۔ ذرا سا دروازہ کھول کر مریضہ کی بیٹی سے بولی۔

ڈاکٹر صاحب آ کر ناراض ہو رہے ہیں۔ ہم نے آپ سے کہا تھا نا کہ ایک گھنٹے میں کام ختم کر لیں۔ آپ نے تین گھنٹے لگا دیے—— اب ہماری نوکری کی خیر نہیں——

بیٹی نے ماں کے چہرے کو ہاتھ لگایا۔ ماسک ابھی گیلا تھا۔ گیلے ماسک کو کھرچنا ناممکن تھا۔

ماں نے آنکھیں کھول کر سوالیہ انداز سے بیٹی کو دیکھا——

بیٹی نے اشاروں سے بتایا ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔

ماں نے بھی اشاروں سے عندیہ دیا۔ منہ صاف کر دو——

تولیہ گرم کر کے بیٹی جب اس کا منہ صاف کر رہی تھی۔ غصے سے بھرے ہوئے ڈاکٹر صاحب اندر آ گئے——

یہ کیا مذاق ہے——؟ ڈاکٹر صاحب نے مختلف چیزیں میز پر بکھری دیکھ کر کہا——

آپ تو تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے آپ نے کتنی بیوقوفانہ اور خطرناک حرکت کی ہے——

جی......آئی ایم سوری——

آئی ایم سوری—— کسی حادثے کی تلافی نہیں ہوتی—— اگر نتائج خطرناک ثابت ہوئے—— تو اس لفظ سوری سے کب تک اپنے آپ کو تسلی دیتی رہیں گی......

اس نے شرمندگی سے سر جھکایا اور بیگ اُٹھا کر باہر نکل گئی——

ڈری سہمی دو نرسیں اندر داخل ہوئیں......

اس وقت نہ میں آپ سے explanation مانگوں گا اور نہ ہی سزا سناؤں گا—— جلدی سے Ventilator لگاؤ—— مشینیں فٹ کرو...... ڈاکٹر نے کہا۔

اس کا نام پروین چودھری تھا۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ برطانیہ چلی گئی تھی۔ وہاں اس کی ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام اس نے نازنین رکھا اور اسے نازی بلاتی تھی—— اس کا شوہر ایک محکمے میں ملازم تھا اور وہ مختلف گروسری سٹورز پر کام کرتے کرتے ایک بیوٹی پارلر تک پہنچ گئی تھی۔ یہ کام اسے پسند بھی آیا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی مصروف تر زندگی میں سے وقت نکال کر بیوٹیشن میں ڈپلوما بھی لے لیا تھا——

یوں چلتے دوڑتے زندگی میں ایک ایسا موڑ آ گیا۔ جب اس کا شوہر ایک گوری کو دل دے بیٹھا۔ گوری کی شرط اول یہی تھی کہ پہلی بیوی کو طلاق دے دے——

اور پہلی کب سوتن کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ یوں طلاق ہو گئی۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ایک کمرے کا فلیٹ لے کر الگ رہنے لگی۔

اگلے دس سالوں میں اس نے آرائشِ گیسو اور زیبائشِ حسن کے کئی اور ڈپلومے بھی لے لیے—— جب اس کی بیٹی نے وہیں...... اپنی پسند سے ایک مصری لڑکے سے شادی کر لی تو وہ پاکستان آ گئی——

اس بڑے شہر میں اُس نے ایک جدید طرز کا بیوٹی سپا کھول لیا——

البتہ اسے نام رکھنے میں بڑی مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ کاروباری نکتہ نظر سے کہ نام انوکھا بھی ہو اور خواتین کے لیے پرکشش بھی—— اور پھر اس میں اس کے اپنے نام کی عکاسی بھی——

ایک دانشور دوست نے پروین چودھری میں سے "پری چہرہ" نکال دیا——

خوب نام تھا۔ پرکشش تھا۔ بلانے میں بھلا لگتا تھا—— نئی نئی مشینیں آ گئیں۔ تربیت دے کر عملہ رکھ لیا۔ چند ہی دنوں میں شہر بھر کی خواتین میں "پری چہرہ بیوٹی پارلر" کے چرچے ہونے لگے......

ہر سال ایک مہینے کے لیے پروین چودھری برطانیہ جاتی تھی۔ پہلے اپنا چہرہ ٹھیک کرواتی تھی۔ پھر وہ سب لوازمات کہ جو فیس لفٹنگ میں کام آتے تھے یہاں لے آتی تھی۔ سال کے سال برطانیہ سے فیس لفٹنگ، بوٹوکس، تھرماج، لیزر اور دوسری قسم کے ماہرین کو بلواتی تھی اور یہاں خواتین کو یہ ساری سہولتیں بہم پہنچاتی تھی۔

اب پروین چودھری ستر سال کی ہو گئی تھی۔ مگر اپنے چہرے اور فگر سے وہ بمشکل چالیس سال کی لگتی تھی۔ وہ خود اپنے پارلر کا اشتہار بن چکی تھی۔ اللہ نے شکل خوبصورت دی تھی۔ شکل کو اس نے بگڑنے نہیں

دیا تھا——

اس کی سدا بہار خوبصورتی اور جوانی کو دیکھ کر اس کی کلائنٹ اسے ہی ''پری چہرہ'' بلانے لگ گئی تھیں۔ اسے محافل میں مدعو کیا جانے لگا تھا—— اس کے انٹرویوز ٹی وی پر نشر ہونے لگے تھے۔ وہ بڑے دلکش انداز میں خواتین کو ہمیشہ خوبصورت اور دلکش رہنے کے Tips بتاتی تھی—— دنوں میں اس کا پارلر شہر کا سب سے مشہور اور معروف پارلر بن گیا تھا۔ بلکہ اب تو پورے ملک سے خواتین اور دوشیزائیں، اپنے چہرے کی بناوٹ بدلوانے اور ہار سنگھار کے جدید تر گر سیکھنے کے لیے اس سے اپائنمنٹ Appointment لے کر آنے لگی تھیں——

یہ دیکھتے ہوئے اس نے اپنے پارلر کی بیس منٹ میں ہفتہ وار لیکچر دینے کا بندوبست کر دیا تھا اور اس کلاس کا عنوان اس نے رکھا تھا—— ''ہار سنگھار عورت کا پیدائشی حق'' اس کا بولنے کا انداز بھی بڑا پرکشش تھا۔ اپنے لیکچر کو دلچسپ بنانے کے لیے جانے کہاں کہاں سے مثالیں لے کر آتی تھی——

خواتین! آپ نے تو سنا ہوگا...... اللہ جمیل و یحب الجمال○

یعنی اللہ حسن ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ دیکھو اللہ نے کتنی خوبصورت دنیا بنائی ہے۔ نیلے آسمان کو ستاروں سے مزین کر دیا اور اس کی آن بان بڑھانے کے لیے چاند کا فانوس ٹانک دیا۔ کس قدر روح پرور ہوتی ہیں چاندراتیں...... جب سے انسان نے لکھنا سیکھا ہے تب سے ہر زمین پر ہر زبان میں وہ چاندنی راتوں کی کہانیاں ہی لکھ رہا ہے۔ کبھی اپنے محبوب کو چاند سا چہرہ بنا دیتا ہے، کبھی چاند کو سندیس لے جانے والا راہبر بنا دیتا ہے——

پوری شاعری پورا ادب چاندنی راتوں کے ذکر سے بھرا پڑا ہے—— پھر آبشار دیکھو، پہاڑ، لالہ زار، ڈوبتے سورج کی شفق...... برسات کا چھم چھم کرتا پانی، غرض آپ جدھر دیکھیں گی آپ کو اللہ کا پیدا کردہ حسن ہی نظر آئے گا...... اور پتہ ہے—— وہ کہتی —— دنیا کی سب سے خوبصورت چیز عورت ہے۔ (یہاں پر عورتیں تالیاں بجاتیں) کیونکہ دنیا خوبصورت ہی اس وقت ہوئی تھی جب حضرت آدم کی خواہش پر اماں حوا کو زمین پر اُتارا گیا تھا۔ (عورتیں پھر تالیاں بجاتیں)

لیکچر کے دوران عورتیں سوالات بھی کرتیں؟

میڈم پری چہرہ! مرد ہرجائی کیوں ہوتا ہے——؟

ہرجائی نہیں ہوتا۔ حسن پرست ہوتا ہے۔ حسن اس کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔

تو پھر عورت کیا کرے——؟

عورت اپنے آپ کو ہر طرح ہمیشہ حسین رکھے —— وہ پوچھتیں——

یہی بتانے کے لیے تو میں یہ پارلر کھول کے بیٹھ گئی ہوں۔ روزمرہ کے کاموں کی تھکاوٹ سے، بچوں کی پیدائش سے—— عورتیں اپنا دھیان نہیں رکھ سکتیں —— عورت کو اپنی طرف دھیان دینا چاہیے۔ بیوی اگر چاہتی ہے کہ اس کا شوہر ادھر ادھر نہ جھانکے تو اس کو ہمیشہ اپنے آپ کو بنا سنوار کر جوان بن کر رہنا چاہیے ——

مرد کے ہرجائی پن کا توڑ ہی یہی ہے—— یہ میں کوئی نئی بات آپ کو نہیں بتا رہی—— صدیوں سے یہ نسخے اور ٹوٹکے چلے آتے ہیں—— آپ کو معلوم نہیں شاید کہ عورتوں کے میک اپ کی بہت سی چیزیں ملکہ نور جہاں نے ایجاد کی تھیں——

ملکہ نور جہاں نے—— عورتیں حیران ہو کر پوچھتیں——

ہاں ہاں—— اور یہ فرشی غرارے، پشواز، لہنگے، انگرکھے سب نور جہاں نے ایجاد کیے تھے۔ آج کل بوتیک والے جن کی نقلیں بنا بنا کر مال کما رہے ہیں —— پتہ ہے تھریڈنگ کا رواج افغانستان سے آیا تھا۔ افغانی عورتیں ایک قسم کی پیسٹ بنایا کرتی تھیں۔ ان کی بچیوں کے چہروں اور بازوؤں پر ذرا بھی بال نہیں ہوتے تھے—— سائنسی طور پر یہ چیزیں مشینوں سے بن کر آنے لگیں—— ہماری نانی اماں کے زمانے میں فیس ماسک اسپغول سے بنایا جاتا تھا۔ جس سے چہرے کی لائنیں مٹ جاتی تھیں—— ہماری نانی اماں بتایا کرتی تھیں کہ ان کے زمانے میں عورتیں لوہے کی سلاخیں لے آتی تھیں۔ انہیں چولہے میں گرم کر کے بالوں کی لٹیں پکڑ کے ان کے گرد لپیٹ دیا کرتی تھیں۔ چند منٹوں میں بال گھونگھریالے ہو جاتے تھے——

ہائے...... اس طرح بال جلتے نہیں تھے——؟

ہرگز نہیں...... ان کی اپنی ٹیکنیک ہوتی ہوگی۔ وہ بنا لیتی ہوں گی۔ آپ جانتی ہیں ملکہ قلوپطرا دودھ کے ٹب میں نہایا کرتی تھی——

اُف...... دودھ کے ٹب میں—— عورتیں حیران ہوتیں۔ اتنا دودھ کہاں سے آتا ہوگا——؟

ملکہ تھی گھر میں مویشی رکھے ہوں گے۔ اچھا میں آپ کو ایک اور حیران کن بات بتاؤں——

ممکن ہے آپ میں سے کسی نے یہ قصہ پڑھا بھی ہو—— تاریخی قصہ ہے—— حضرت سلیمان نے ملکہ بلقیس سبا کو بلا بھیجا۔ وہ اپنے زمانے کی انتہائی ذہین و فطین اور حسین عورت تھی۔ اس کی ذہانت کا

امتحان لینے کے لیے حضرت سلیمان نے زمین پر ایسے شیشے کا فرش بچھوایا جو دور سے پانی لگتا تھا—— جب ملکہ سبا کی سواری اس فرش پر رکی اور اس نے باہر جھانکا تو باہر ہر طرف پانی دکھائی دیا۔ یعنی شیشے کا فرش اُسے بالکل پانی ہی نظر آیا—— اس خیال سے کہ اس کا لباس فاخرہ کہیں گیلا نہ ہو جائے ملکہ نے اپنا لباس اوپر اُٹھا لیا اور پھر فرش پر قدم رکھا—— قدم رکھنے کے بعد اسے خجالت ہوئی کہ یہ تو شیشہ تھا۔ پانی نہیں تھا——

چونکہ اس کی پنڈلیاں ننگی ہوگئی تھیں۔ وہ حضرت سلیمان نے دیکھ لیں۔ اس کی پنڈلیوں پر بال تھے

——

بعد میں انہوں نے اسے ایک نسخہ بھجوایا۔ پنڈلیوں سے بال صاف کرنے کا—— کیونکہ اتنی حسین عورت کی پنڈلیوں پر بال بہت بدصورت دکھائی دے رہے تھے—— تب سے عورتوں کی پنڈلیوں سے بال صاف کرنے کا رواج عام ہوا——

تب سے—— ہیں......؟ عورتیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پوچھنے لگتیں—— اتنی صدیوں سے—— ہیں

——واہ—— میڈم......واہ——

اور کیا...... یہی تو میں آپ کو بتاتی رہتی ہوں کہ عورت کے لیے سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو خوبصورت بنانے رکھنے کا رواج قدیم ہے اور سالہا سال کے تجربے اور طریقے بھی ہیں۔ یہ سب ابتدائے آفرینش سے ہو رہا ہے۔ پہلے اس کام کے لیے مشاطائیں ہوتی تھیں...... مگر بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ ان سہولتوں کے نام بھی جدید ہوتے گئے۔ آج کل بیوٹی سپا، بیوٹی پارلر وغیرہ قسم کے ناموں کا رواج پڑ گیا ہے۔ ذہین لوگوں نے مشینیں ایجاد کر دیں۔ مشینوں نے کام آسان کر دیے۔ ایک مشین اگر بال گھونگھریالے بناتی ہے تو دوسری مشین گھونگھریالے گھنے بالوں کو سیدھا کر دیتی ہے۔ اب دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں رہا——

کبھی کبھی اس کی کلاس میں کوئی حجاب والی عورت اسے آڑے ہاتھوں لیتی——

میڈم پری چہرہ! یہ جو عورتیں بوٹوکس کرا کے اپنا چہرہ جوان رکھتی ہیں۔ کیا مذہب میں اس کی اجازت ہے؟ بہت سی عورتیں نقش ونگار بدلوا لیتی ہیں۔ یعنی آج کل ناک پتلی اور ستواں کرانے کا بڑا رواج ہے۔ بعض عورتیں ہونٹ موٹے کروا لیتی ہیں۔ کوئی تل لگواتی ہے۔ کوئی تل نکلوا دیتی ہے۔ آپ کے خیال میں یہ گناہ نہیں——

میڈم پری چہرہ زور سے قہقہہ لگاتی —— ڈارلنگ ایک معصوم سی تمنا کو تم گناہ اور ثواب کے دائرے میں گھسیٹ لائی ہو۔ کیا اس کام سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہے۔ کسی کا گھر برباد ہوتا ہے...... کبھی غور کیا ہے اس ملک میں کیسے کیسے مکروہ کام ہو رہے ہیں۔ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ ہو رہی ہے۔ گدھے کا گوشت فروخت ہو رہا ہے اور یہ جو مصالحہ جات کی کمپنیاں ہیں، یہ مصالحوں کے اندر کیا کچھ ملا رہی ہیں اور آٹے ہی کو لو—— جو غریب امیر دونوں ہی کھاتے ہیں۔ کیا یہ واقعی اصلی آٹا ہے جو ہم روزانہ کھاتے ہیں۔ تو کیا ہم نے آٹا کھانا بند کر دیا ہے۔ کیا اس ملک میں چیک اینڈ بیلنس کا کوئی منظم انتظام ہے...... آئے دن خبریں نشر ہوتی ہیں جعلی دوائیں بنانے والے لوگ پکڑے گئے—— تو کیا دوائیاں بکنی بند ہوگئیں—— تم نے کبھی ان لوگوں کے آگے گناہ اور ثواب کا سوال رکھا ہے جو بچوں کے خشک دودھ میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ جو چاکلیٹ اور ٹافیوں میں ملاوٹ کر رہے ہیں...... بیوٹی پارلر میں گھستے ہی تمہیں گناہ اور ثواب نے گھیر لیا——

نہیں میڈم...... میرا یہ مطلب نہیں تھا جو آپ سمجھ رہی ہیں...... میرا کہنے سے مطلب یہ تھا۔ یہ صورت تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ اس میں دخل اندازی کیا قدرت کے کاموں میں دخل اندازی کے مترادف نہیں ہے......؟

او میری پگلی بیٹی! اتنی گہرائی میں نہ جاؤ...... یہ دنیا تو ایک تجربہ گاہ ہے۔ ہر فیلڈ میں—— تم اللہ کے احکامات بجاتی رہو۔ دل میں اس کی یاد رکھو۔ اللہ تمہارا عمل دیکھتا ہے۔ چہرے نہیں دیکھتا—— سنو! جب اس کے پیدا کردہ بدن میں کوئی روگ پیدا ہو جاتا ہے تو آپریشن کرتے وقت گناہ اور ثواب کا سوال اُٹھایا جاتا ہے۔ آج کل آنکھیں دان کی جا رہی ہیں۔ اعضاء تبدیل ہو رہے ہیں۔ جگر اور گردہ کی پیوندکاری ہو رہی ہے—— کسی کا گردہ کسی کو لگایا جا رہا ہے اور تو اور اب تو دل بھی مصنوعی لگائے جا رہے ہیں...... مگر ذرا سی ناک ستواں کرانے پر آپ کو گناہ اور ثواب کے وسوسے نے گھیر لیا——

اگر وہ ان کاموں کی نفی کر دیتی۔ تو اس کا پارلر کیسے چلتا—— اس کے پارلر میں آئے دن ایسی لڑکیوں کا اضافہ ہو رہا تھا جو اپنے نین نقش ٹھیک کروانے آتی تھیں۔ فلم یا ڈرامے کی شوٹنگ کے وقفے میں دوڑی آتی تھیں اور کہتی تھیں——

میڈم—— دیکھیں میری آنکھوں کے نیچے لائنیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ پلیز ذرا جلدی سے ٹھیک کر دیں۔ میری شوٹنگ چل رہی ہے۔

میڈم پری چہرہ جانتی تھی کہ یہ بھی منشیات کی طرح کی ایک لت ہے۔ جس کو لگ جائے وہ اسے

چھوڑ نہیں سکتا——لوگ لمبی عمر کی تمنا کرتے ہیں۔ مگر بوڑھا ہونا کوئی نہیں چاہتا—— بڑھاپے سے سب خوف زدہ رہتے ہیں۔

بعض عورتیں ایسے سوالات بھی اُٹھا دیتی تھیں——

میڈم جی! آج کل مردوں میں بھی بوٹوکس کروانے اور فلرز ڈلوانے کا بہت رواج چل نکلا ہے۔

تو کیا مردوں کو جوان دکھنے کا شوق نہیں ہوتا۔

خاص طور پر سوشل میڈیا پر تو چہرہ ہی چلتا ہے——

ہائے میڈم جی—— اتنے برے لگتے ہیں وہ ——کوئی ناک چڑھا کر کہتی—— اسی اور نوے سال کے مرد جب ایسا ٹریٹمنٹ کروا کے آتے ہیں تو ان کے چہرے ڈبل روٹی کی طرح پھولے پھولے نظر آتے ہیں۔ صاف لگتا ہے انہوں نے چہرے کے بل نکلوائے ہیں اور گڑھے بھروائے ہیں۔ پھر جوان لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر یوں پروگرام کرتے ہیں جیسے نوعمر ہوں——

آپ کو ان سے حسد ہوتا ہے یا جوان لڑکیوں سے جو ان کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہیں۔

میڈم اس خوبصورتی سے جواب کا رُخ موڑتیں کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ کیونکہ اب تو مرد بھی ان کے کلائنٹ تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے میڈم پری چہرہ نے شہر کی ایک نئی کالونی میں ایک خطہ زمین خرید لیا تھا اور اس پر چار منزلہ جدید ترین پارلر بنا لیا تھا۔ جس کا ایک فلور صرف مردوں کے ٹریٹ منٹ کے لیے مختص کر دیا تھا اور ان کے لیے مردانہ عملہ رکھ لیا تھا——

اس بلند و بالا عمارت کے اوپر ایک سائن بورڈ لگا تھا۔ جو دور سے نظر آتا تھا اور جس پر جلتی بجھتی روشنیوں کے ساتھ جلی حروف میں لکھا تھا: ......''چہرہ حسین تو دل جوان......دل جوان تو قسمت مہربان''

ستارے کبھی ایک چال پر نہیں رہتے—— اس روز میڈم پری چہرہ اسلام آباد میں اپنے پارلر کی نئی برانچ کھول کر موٹروے سے واپس آ رہی تھیں۔ دھند کی وجہ سے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور کولہے کی ہڈی اُتر گئی——

سب سے بڑے اور سب سے مہنگے ہسپتال میں ان کا علاج شروع ہو گیا۔ لوگ باگ کہہ رہے تھے میڈم کو نظر لگ گئی۔

اس عمر میں اتنی سمارٹ اور اتنی Active کم عورتیں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کے دو آپریشن ہوں گے۔ پہلے آپریشن کے چار ہفتے کے بعد دوسرا ہو گا جو ذرا سیریس ہو گا۔

ابتدا میں کچھ لوگوں کو ملنے کی اجازت تھی۔ پھر اجازت منسوخ ہو گئی۔ صرف نازو ہی کھانا لے کر آتی تھی۔

دوسرا آپریشن بھی ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ مگر ڈاکٹروں نے بتایا کہ انہیں کچھ دن Ventilator پر رکھ کر دیکھا جائے گا——

اس کے بعد ہی پرائیویٹ کمرے میں جانے کی اجازت ہو گی۔ ایک دن نازو آئی تو ماں کو ہوش و حواس میں باتیں کرتے پایا۔

بولی ''ماما! آپ کی بہت سی سہیلیاں مزاج پرسی کو آنا چاہتی ہیں......مگر آپ کا چہرہ......وہ پھر رُک گئی۔

ماں نے کہا—— بھنویں اور بال ٹھیک کر دو......پہلے......

ہاں ماما—— ساری بھنویں سفید ہو گئی ہیں۔ سر کے بال بھی—— تھوڑا سا ٹریٹ منٹ کر دوں——

ماں نے سر ہلا کے حامی بھر لی۔

جاتے جاتے نازو نے ڈیوٹی پر موجود نرسوں سے ساز باز کی----- پہلے تو انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور کہا----- ڈاکٹر صاحب کا آرڈر ہے دن میں صرف ایک گھنٹہ وینٹی لیٹر اُتارا جائے گا۔ صرف Observe کرنے کے لیے—— وہ بھی ہم اتنی دیر سر پر موجود رہیں گی۔ مگر نازو نے سبز نوٹ دکھا کر ان کو منا لیا اور وعدہ کیا کہ وہ سارا کام ایک گھنٹے سے پہلے ہی مکمل کر لے گی۔

اگلے دن وہ پورے ساز و سامان کے ساتھ آ گئی۔ تھریڈنگ کی، بال کلر کیے—— چہرے کی مساج کی اور ماسک لگا دیا——

اس کام میں تین گھنٹے لگ گئے—— چہرہ تو ٹھیک ہو گیا مگر دل ٹریک سے اُتر گیا۔ اسی رات انہیں ایک ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ زندگی ہار گئیں۔

جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں خبر پھیل گئی۔ وقتِ رُخصت ان کا چہرہ دیکھنے کے لیے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔

ہائے کتنی فریش لگ رہی ہیں——

لگتا ہے میڈم جی ہسپتال سے نہیں پارلر سے نکل کر آ رہی ہیں۔ دیکھو بھنویں بھی اسی طرح خوبصورت ہیں۔

چہرے پہ کتنا نور ہے——

اطمینان دیکھو......سکون سے سو رہی ہیں۔ ایک شکن نہیں ماتھے پر—— عورتوں کی باتیں سن کر نازو دھاڑیں مار مار کر روتی جا رہی تھی۔

✦✦✦

فضل منزل

مسعود مفتی

1960ء کی دہائی میں نیا دارالخلافہ بسایا جانے لگا۔ تو یہ اس کی اولین تعمیرات میں شامل تھی۔ آٹھ کنال رقبے پر کشادہ گھر اور وسیع لان کھلی شہادت دے رہے تھے کہ یہ کسی متمول شخص کی ملکیت ہے۔ مزید تصدیق اس وقت ہوگئی جب دھات کے ڈھالے ہوئے سنہری حروف اس کے ماتھے پر سج گئے۔ ''ہٰذا من فضل ربی'' دیکھنے والے اتنے مرعوب ہوتے کہ کھلے ہوئے بے آباد علاقے میں گنی چنی چند عمارتوں میں محض نشان دہی کے لیے اسی عبارت کے حوالے سے ''فضل منزل'' کہنے لگے۔

اس سے پہلے کا حال تو خدا ہی جانے لیکن یہ خاندان کم وبیش ایک صدی پہلے سے اپنے ذاتی اعمال پر خدائی انعام کے سونے کا ورق چسپاں کر رہا تھا۔ جب 1857ء کی ہاری ہوئی جنگِ آزادی میں انہوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر مغلیہ سلطنت کی قبر میں مٹی ڈالی تھی اور بعد میں وسیع جاگیر کا انعام ''الحمدللہ'' پکارتے ہوئے قبول کیا تھا۔ پھر 1947ء تک یہ خاندان انگریز حاکموں کی چلتی بگھی کا ایک فعال پہیہ بنا رہا۔ جبکہ دوسرا پہیہ وہ لوگ تھے جو خفیہ پولیس کو خاموش مخبری کرتے تھے۔ ان میں مسجدوں کے مولوی، گوردواروں اور مندروں کے پروہت بڑی تعداد میں شامل تھے۔ عجب نہ تھا کہ چند ایک کے علاوہ سارے برٹش انڈیا کے علمائے کرام مطالبہ پاکستان کی سرتوڑ مخالفت کرتے رہے اور برٹش راج کی مراعات سے فیض یاب ہوتے رہے۔

ان کی بدقسمتی سے پاکستان بن گیا تو بڑی متحرک اور ہمکتی ہوئی نوزائیدہ قوم بڑی تیزی سے ترقی کے مدارج طے کرنے لگی اور یہ خاندان پس منظر میں چلا گیا لیکن صدر ایوب کی بادشاہت کا دربار جب اچھی طرح جم گیا تو اس خاندان نے بھی کئی جوڑ توڑ کر کے اور متعدد وسیلوں کا سہارا لے کر دربار تک رسائی حاصل کر لی اور صدر ایوب خان ان کی جاگیر پر شکار کھیلنے آ گئے۔

شکار غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ کچھ پرندے خود اُڑے، بے شمار پرندے پنجروں سے اُڑائے گئے۔ کچھ شکاریوں کی بندوق سے زخمی ہوئے۔ زیادہ تر بغیر اُڑے ہی زخمی کر دیے گئے لیکن جو زخمی پرندہ بھی صدر صاحب کے سامنے رکھا گیا وہ اس قصیدے کے ساتھ پیش کیا گیا کہ اسے آپ ہی کا نشانہ بننے کا شرف حاصل ہے۔

کچھ عرصہ بعد شکر پڑیاں کے اونچے نیچے غیر آباد علاقے میں نئے دارالخلافے کی بنیاد رکھی گئی۔ جلد ہی درخت اور جھاڑیاں ہر طرف سے صاف ہونے لگے۔ تو شاہراہوں اور سڑکوں کی نشان دہی سے اسلام آباد کے خدوخال پودوں کی پنیری کی طرح پھوٹنے لگے اور سب سے پہلے حکومت کے مقربین کو پلاٹ الاٹ ہونے لگے۔ اس خاندان کے سربراہ کو نہ صرف بڑا سا رہائشی پلاٹ مل گیا بلکہ ساتھ ہی بنک کا قرضہ بھی ملا۔ ایسے قرضے تو تمام بینک ہر ضرورت مند کو دے رہے تھے لیکن اس خاندان کو ان کی ادائیگی کے لیے اپنی چھوٹی انگلی بھی نہیں ہلانا پڑی۔ کیونکہ حکومت کی دیگر مراعات نے کچھ ادائیگی اور کچھ معافی تلافی کر دی۔ اس لیے جب عالی شان مکان مکمل ہوگیا اور عربی رسم الخط کے سنہرے حروف اس کے ماتھے کا جھومر بن گئے تو خانہ آبادی کی شاندار دعوت میں صدر صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد جب صدر ایوب خان کی دس سالہ حاکمیت کا جشن ملک بھر میں منایا جا رہا تھا تو فضل منزل کے خصوصی جشن طرب میں رنگا رنگ آتش بازی بلند فضاؤں کو دیر تک منور کرتی رہی۔

ملک بھر سے ایسی آتش بازی نے ستاروں کو بھی ہلا دیا۔ تو ان میں سے قسمت کا ستارا غروب ہونے لگا۔ چند ہی ماہ میں دس سالہ جشن آزادی ملک گیر احتجاجی جلوسوں میں بدل گیا اور ''ایوب کتا ہائے ہائے'' کے نعرے ہر طرف گونجنے لگے۔ ان دنوں فضل منزل اس ریلوے سٹیشن کی طرح ویران ہی رہی جس پر سے برانچ لائن کی آخری ٹرین گزر چکی ہو۔

جنرل ایوب خان کے فوراً بعد جنرل یحییٰ کا دور آیا تو فضل منزل اندر باہر سے دوبارہ روشن ہونے لگی اور ان مشاغل کا مرکز بن گئی جن میں صدر صاحب کی دلچسپیاں تھیں۔ جام و مینا کی کھنک، مچلتی تھرکتی ڈانس پارٹیاں، ابن الوقت قسم کے زیرک مرد سماجی دوڑ والی خودنما خواتین اور ''عالم دوبارہ نیست'' کے موڈ میں ڈوبی ہوئی رنگ رلیاں اس چار دیواری کو نہ صرف ''فردوس برروئے زمیں است'' قرار دینے لگیں بلکہ ''ہمیں است وہمیں است وہمیں است'' کی تکرار بھی کرنے لگیں۔

اس دور میں اس مکان کی مکانیت تو وہی رہی لیکن مکینوں کا رُتبہ بلند سے بلندتر ہوتا رہا۔ کیونکہ ان رت جگوں کی کھوکھ سے خاص خاص درباریوں کے لیے نئے نئے کاروبار پیدا ہو رہے تھے۔ اس طرح یہ

پرانا متمول جاگیردار خاندان آج کا نمایاں کاروباری خاندان بھی بن گیا۔

پھر 1971ء کا سانحہ ہوگیا۔ جس میں ملک آدھا رہ گیا لیکن آدھا کرنے والوں کی اقتدار کی ہوس دُگنی ہوگئی۔ جوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تنگی چوگنی ہوتی گئی اور فضل منزل کی چار دیواری میں پلنے والی تمنائیں اور اُمنگیں بھی اسی تناسب سے بڑھتی رہیں۔ جیسے بند کیتلی میں ہلکی ہلکی شوں شوں بڑھ کر پہلے بلبلے اور پھر اُبال بن جاتی ہے۔

شوں شوں تو کئی برس پہلے سے جاری تھی لیکن ذوالفقار علی بھٹو کا دور آیا تو سارے گھر میں جیالے بلبلوں کی مانند اُڑتے نظر آنے لگے اور عوامی باتوں کا شور اُٹھنے لگا لیکن جب دھیرے دھیرے اقتدار کا شعلہ زور پکڑنے لگا تو عوامی بلبلے غائب ہونے لگے اور صرف خواص کا اُبال ہی اس عمارت میں سما سکا۔ شعلہ بلند تر ہوا تو اسی ابال کی ظاہری شکل سٹیم بن کر بدلنے لگی اور خواص کی ظاہری سرگرمیاں تحلیل ہو کر پوشیدہ بننے لگیں۔ جن کی وجہ سے چار دیواری سے باہر پھیلے ہوئے کاروباروں کی قانونی ماہیت بدلنے لگی۔ ان میں سے کچھ زیادہ نمایاں ہونے لگے اور کچھ درپردہ چلے گئے۔ جن کا پھیلاؤ دھیرے دھیرے بڑھتا گیا۔

1977ء کے قومی الیکشن نے بھٹو کے اقتدار کا شعلہ مزید بڑھا دیا۔ تو سٹیم کے بڑھنے سے ڈھکنا ہلنے لگا۔ تب جنرل ضیاء الحق نے شعلہ بجھا کر ماچس اپنی جیب میں ڈال لی اور ملک گیر مذہبی صف بندی کر کے اسی ماچس سے جا بجا اگر بتیاں سلگا دیں۔ جن کی سب سے زیادہ خوشبو فضل منزل سے اُبھرتی تھی۔

اس زمانے میں اس چار دیواری کے اندر اور باہر کے وسیع شامیانوں کے نیچے میلاد کی جو ایمان افروز محفلیں ہوتی تھیں ان کا چرچا دور دور تک ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے بڑے ہال میں اکثر اوقات جید علماء کرام سیرت النبی اور اسوۂ حسنہ پر لیکچر دیتے۔ جن سے استفادے کے لیے ہمسایہ گھروں میں لاؤڈ سپیکر کی تاریں جاتی تھیں تاکہ برقعہ پوش یا حجاب کرنے والی خواتین کثیر تعداد میں شریک ہو کر سن سکیں۔ بعض اوقات صرف عورتوں کے لیے قرآن خوانی کی محفلوں میں مبلغ خواتین چادر اور چار دیواری کی اہمیت اُجاگر کرتیں۔

اس خاندان میں اسلامی جذبے کی اس شدت کو حکومت وقت نے بھی خوب سراہا اور کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (CDA) نے جب نیا سیکٹر کھولا تو اس خاندان کے سربراہ کی درخواست پر مسجد کی تعمیر کے لیے ایک وسیع مگر مخصوص پلاٹ الاٹ کر دیا گیا جس کے ایک کونے میں نہ معلوم کب سے ایک پرانی فراموش کردہ قبر بھی تھی جہاں کبھی کبھار کوئی سبز جھنڈی لگا دیتا تھا یا سرسوں کا دیا جلا دیتا تھا۔ الاٹمنٹ کے فوراً ہی بعد وہاں تعمیر کا آغاز ہوگیا۔ آج وہاں عالی شان مسجد ہے۔ انتہائی خوبصورت مزار ہے اور چار منزلہ مدرسے کی عمارت ہے۔ مزار کے سجادہ نشین اور مدرسے کی انتظامیہ کا کسی نہ کسی شکل میں جاگیر سے بھی تعلق ہوتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق ہوائی حادثے میں اچانک فوت ہو گئے تو فضل منزل سے بھی اسی دم جملہ روحانیت رُخصت ہوگئی اور دنیاداری بڑے ٹھسے سے حسبِ سابق واپس آگئی۔

کچھ عرصہ تک جلد جلد حکومتیں بدلنے کا دور رہا اور بعد میں طویل دورانیے والے حاکم آنے لگے۔ جنرل مشرف، آصف زرداری اور نواز شریف وغیرہ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس زمانے میں اور بھی بہت کچھ ہوتا رہا۔ گورننس اور اچھی حاکمیت اپنا منہ چھپا کر ایسے غائب ہونے لگی جیسے برف کی ڈلی کو دھوپ میں رکھ دیا گیا ہو۔ بھتہ خوری...... اغوا برائے تاوان...... ہڑتالیں اور دھرنے...... سڑکوں پر بھلے چنگے متحرک انسانوں کی پستولوں سے چاند ماری...... بم دھماکے...... گھروں، فیکٹریوں اور دکانوں میں آتش زنی اور قتل و غارت...... سکولوں اور کالجوں کی کلاسوں پر حملے...... واجب القتل قرار دینے والے فتووں کی آواز اذانوں سے بھی بلند...... مسجدوں میں سجدہ ریز نمازیوں پر مشین گن کی بوچھاڑیں...... کراچی میں بوریوں میں بند لاشیں...... ہپناٹزم کی نقالی سے مسحور سامعین سے خطابات اور سمندر پار سے کوہِ ندا کی فون پر گھن گرج...... ملک بھر میں دن رات مردے اُٹھا اُٹھا کر تھک جانے والی پاکستانی قوم...... وغیرہ وغیرہ......

کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ کیوں اور کیسے ہو رہا تھا اور کون کر رہا تھا۔ ساری قوم حیران و پریشان، دم بخود اور بدن دریدہ۔

اس دوران فضل منزل میں لوگوں کی نقل و حرکت کا بھی کسی کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہاں کی زندگی کے ظاہری اور پوشیدہ شب و روز کیسے ہیں۔ وہاں کون آتا ہے کون جاتا ہے۔ درون خانہ چپکے چپکے کیا مشورے ہوتے رہتے ہیں۔ بڑی بڑی شاندار یا مختصری ڈھکی چھپی دعوتیں کیوں ہوتی رہتی ہیں اور شرکاء میں کبھی مانوس، کبھی غیر مانوس اور کبھی اجنبی چہرے کیوں نظر آتے ہیں۔ جن میں راولپنڈی کے باڑہ بازار یا رسالپور کے قریب راشہ کئی کلاتھ مارکیٹ کے بیوپاری یا پنڈی گھیب میں اخلاص گاؤں کے اسلحہ ساز بھی دیکھے جاتے تھے۔ ایسی ہی چہ میگوئیاں تھیں کہ فضل منزل کے مکین بار بار بیرونی ممالک کے سفر کیوں کرتے رہتے ہیں۔

لوگوں کو حیرت تب ہوئی جب دو پراپرٹی ڈیلروں سے یہ خبر نکلی کہ انہیں فضل منزل کے لیے کرایہ دار تلاش کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ کیونکہ مالکان کا دیگر ممالک میں کاروبار اتنا پھیل گیا ہے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کے لیے دوبئی نقل مکانی کر رہے ہیں۔

اتفاق سے دونوں ڈیلروں کی طرف سے ایک ہی دن میں دو اُمیدواروں کی درخواست ملی جن میں سے ایک کسی بیرونی ملک کا سفارت خانہ تھا۔ انہیں اپنا دائرہ کار بڑھانے اور مزید عملے کے لیے ڈپلومیٹک اینکلیو (Diplomatic Enclave) سے باہر ایک بڑے گھر کی ضرورت تھی۔ کرایہ منہ مانگا تھا۔ کمیشن بھی اچھی تھی اس لیے متعلقہ پراپرٹی ڈیلر بھاگا بھاگا فضل منزل پہنچا تاکہ کوئی اور ڈیلر اس سے پہلے نہ پہنچ جائے۔

فضل منزل کے لیے یہ ایک اور فضل تھا۔ مالک مکان فوراً راضی ہو گئے اور ابتدائی کارروائی بھی جلد ہی مکمل ہو گئی لیکن جب کرایہ نامہ پر دستخطوں کا وقت آیا تو محتاط الفاظ میں ایک مضبوط مطالبہ بھی آ گیا کہ مکان کی پیشانی پر عربی کے حروف کی جو اسلامی علامت ہے اسے ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ یہاں غیر مسلم رہیں گے اور یہ عمارت اب ایک غیر مسلم ملک کی نمائندگی کرے گی۔

اتنے بڑے فضل سے انکار کرنا کفرانِ نعمت تھا لیکن تعمیل میں بھی ایک قدیم بھرم کھل جانے کا خطرہ تھا اس لیے مالک مکان نے سوچ بچار کے لیے چند دن کی مہلت مانگ لی۔

دوسرے پراپرٹی ڈیلر کو بھی کسی طرح یہ خبر مل گئی۔ پہلے تو وہ گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اسی علاقے کی مسجد کے مولوی صاحب سے مشورہ کرنے گیا۔ تو اس کی جیب کافی پھولی ہوئی تھی۔ چنانچہ طویل ملاقات کے دوران قریبی بیکری کو چائے اور دیگر لوازمات کے آرڈر بھی جاتے رہے۔

کافی دیر بعد وہ جیب کے اُبھار کے بغیر نکلا تو گھر یا دفتر جانے کی بجائے اس کے قدم اب فضل منزل کی طرف اُٹھ رہے تھے۔

وہاں پہنچ کر پہلے تو اس نے اپنے اُمیدوار کی حمایت میں بات کی اور یقین دلایا کہ اس کی خواہش ہے کہ مکان کی پیشانی پر عربی عبارت کا سنہرا پن دوبالا کیا جائے۔ کیونکہ یہ رحمت کی نشانی ہے۔ پھر سرگوشیوں میں یہ بھی بتایا کہ یہ خبر مولوی صاحب تک بھی پہنچ گئی ہے اور ان کی رائے یہ ہے کہ قرآنی آیات میں استعمال ہونے والے یہ عربی الفاظ برسوں سے یہاں آویزاں ہیں۔ اب اگر دنیاوی دولت کے لالچ میں انہیں یہاں سے ہٹا دیا گیا تو اس زبان کی بے حرمتی کا خطرہ ہے جس زبان میں نزول قرآن ہوا۔ بلکہ یہ بات سن کر انہیں اتنا صدمہ ہوا تھا کہ ان کے اگلے جمعے کا وعظ بھی قرآنی زبان کی حرمت کے متعلق ہوگا۔

یہ سن کر مالک مکان سوچ میں پڑ گئے اور جب اگلے دن پہلے پراپرٹی ڈیلر نے سودا مکمل کرنے کی یاد دہانی کرائی تو ان کا تذبذب دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ پھر اس کے اصرار پر مالک مکان نے مولوی صاحب کی رائے اور وعظ کے ممکنہ اثرات سے آگاہ کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد پہلا پراپرٹی ڈیلر بھی نسبتاً زیادہ وزنی جیب کے ساتھ مولوی کو ملنے جا رہا تھا۔ یہ ملاقات بھی کافی طویل تھی اور وہاں سے نکل کر وہ بھی فضل منزل کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر مالک مکان سے اجازت چاہی کہ وہ مولوی صاحب کو بھی لے آئے تاکہ وہ خود موقع ملاحظہ کر سکیں اور مالک مکان کا نقطہ نظر بھی سن سکیں۔ کیا پتہ باہمی غور و خوض سے کوئی اسلام پسند حل نکل آئے۔

رضامندی لیتے ہی وہ ترت گیا اور مولوی صاحب کو اپنی کار میں بٹھا کر لے آیا۔

کافی دیر تک گفتگو اور خاطر مدارات ہوتی رہی۔ بالآخر مولوی صاحب کا فرمان یہ تھا کہ اگر قرآنی زبان عربی کی حرمت کی روح برقرار رہے تو اس کا اظہار بدلنے میں کوئی حرج نہیں۔

اس فیصلے کی روشنی میں مسئلہ یوں حل ہو گیا کہ قانون کی رو سے کرایہ نامہ کے دو اصل پرت بنائے جائیں گے۔ ایک مالک مکان کے لیے اور دوسرا کرایے دار کے لیے لیکن شرط یہ ہوگی کہ مالک مکان کی پرت کی پیشانی پر عربی رسم الخط میں وہی عبارت لکھی جائے گی جو مکان کی پیشانی پر لکھی ہے۔ کیونکہ ایصالِ حرارت کی طرح یہ ایصالِ حرمت ہے اور اس اندراج کی روح مکان کی ایک دیوار سے اسی مکان کے کرایے نامے پر منتقل ہونے کی وجہ سے برقرار رہتی ہے اور ٹوٹتی نہیں ہے یا مجروح نہیں ہوتی۔

مزید برآں کرایے دار کو قبضہ دینے سے پہلے لازمی مرمت کے دوران مکان کی پیشانی سے سنہرے حروف اُتار لیے جائیں گے اور بطور امانت اس مقبرے یا مدرسے میں بہ حفاظت رکھ دیے جائیں گے جو مالک مکان نے اسلام آباد کے نئے سیکٹر میں نئی مسجد سے ملحق بنوائے ہیں۔ اس طرح ان عربی حروف کی تعظیم و تکریم کا رشتہ مالک مکان کی ذات سے نہیں ٹوٹے گا۔

مولوی صاحب کی اسلامی فراست سے بیرونی سفارت کار کو حسب منشا مکان مل گیا۔ فضل جاریہ سے سرشار مالک مکان خوشی خوشی دوبئی چلا گیا...... اور اس ثالثی کی آمدنی سے مولوی صاحب نے اپنے لیے نئی کار خریدی۔ جس کے پچھلے شیشے پر عربی کے سنہری حروف میں لکھا ہوا تھا ''ھذا من فضلِ ربی''

خلاء

نیلم احمد بشیر

مہمانوں کے آنے سے پہلے فضیلہ نے اپنے بیک یارڈ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ سب کچھ کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ نفاست سے کٹی ہوئی ہری گھاس، ٹراپیکل پھولوں والے سرامک کے نمائشی گملے، لان کے ایک طرف نیلے نگینے کی طرح چمکتا ہوا بڑا سا سوئمنگ پول اور اس میں تیرتے صاف پانی سے اٹھتی کلورین کی مہک، اطراف میں بچھی پکنک ٹیبلز پر ہر طرح کا سامان خورد ونوش۔

"بڑی گرینڈ پارٹی لگ رہی ہے۔ فیزی!" فضیلہ کے شوہر طارق احمد نے پارٹی کی تیاریاں دیکھ کر اپنی بیوی کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

"بس دیکھ لیں تیاری، آپ کو تو پتہ ہی ہے آپ کی بیٹر ہاف کی پارٹیاں کتنی سپیشل ہوتی ہیں۔ مہینوں اب سٹیٹ نیو یارک کی پاکستانی کمیونٹی میں چرچے ہوتے رہیں گے ہمارے۔"

فضیلہ اترا کر بولی اور قریب جا کر میزوں کو چیک کرنے لگی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ ہر میز پر سفید میز پوش بچھا تھا جس پر بجی اعلیٰ کوالٹی کی ایسی خوبصورت ڈسپوزیبل پلیٹیں اور گلاس رکھے تھے جو دور سے بالکل اصلی چائنا کے لگتے تھے۔ باربی کیو انگیٹھیاں پہلے ہی جلا دی گئی تھیں جن پر سکتے ہوئے سیخ کباب، چکن پیس اور یو ایس ڈی اے گریڈ ون کے بیف سٹیک کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

"یار فیزی! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔" طارق زور زور سے ہنسنے لگا۔

"پلیز تاری! ابھی سے ٹپسی ہونے لگے تو آگے جا کر کیا ہو گا۔ ابھی تو پوری شام پڑی ہے۔۔۔۔" فیزی نے خود سے چپکتے ہوئے طارق کو اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کا ڈرنک چھین لیا اور خود پی لیا۔

"یو آر اے ڈیلو" طارق نے اسے بانہوں میں کھینچ لیا اور دونوں ہنس پڑے۔ ان کی نظریں اپنے ملین ڈالر ہاؤس پر پڑیں اور مسرت و اطمینان سے بھر گئیں۔ اللہ نے انہیں کتنا نوازا تھا۔ روپے پیسے کی ریل پیل اور آپس میں محبت۔ ایک ہونہار، فرمانبردار پیارا سا بیٹا اور اس کی آئندہ زندگی کے خوشگوار خواب اور انہیں کیا چاہیے تھا؟ آج وہ بے حد خوش تھے کیونکہ ان کے بیٹے عمران نے اپنے ہائی سکول سے آنرز سٹوڈنٹ اعزاز کے ساتھ گریجویشن کیا تھا اور سپورٹس میں بھی ڈسٹنکشن (Distinction) حاصل کی تھی۔

وہ چاہتے تھے کہ ساری کمیونٹی والے عمران کو کامیابی کی راہوں پر گامزن ہونے پر اپنی نیک تمناؤں سے نوازیں اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ ہنسیں بولیں، ہلہ گلہ کریں کیونکہ زندگی کی کامیابیوں کو اپنے دوستوں سے شیئر کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

عمران کو کاؤنٹی سکولوں کے مابین مقابلوں میں بھیجا جاتا تھا۔ جہاں سے وہ ہمیشہ ٹرافیاں جیت کر لاتا اور اپنے سکول اور ٹاؤن کا نام روشن کرتا۔ مقامی اخبارات میں اس سے متعلق خبریں اور تصاویر چھپتیں اور سب سے شاباش ملتی۔ طارق اور فضیلہ کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا اور وہ بیٹے کو سو سو دعائیں دیتے۔

امریکہ میں ہر طرح سے کامیاب زندگی گزارنے کے باوجود فضیلہ اور طارق احمد کے دلوں میں وطن کی محبت زندہ تھی۔ وہ باقاعدگی سے پاکستان جاتے اور کئی اداروں اور این جی اوز کو غریبوں کی مدد کرنے کے لیے موٹے موٹے چیک دیتے رہتے۔

طارق اپنے بیٹے عمران کو پاکستان کے بارے میں بتاتے اور یاد دلاتے کہ وہ بنیادی طور پر ایک پاکستانی امریکن بچہ ہے، اسے اپنی اصلیت، شناخت اور حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے۔

"جو لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے ان کی آئندہ نسلیں بھٹک کر رہ جاتی ہیں۔ بیٹا۔" کبھی کبھار وہ عمران کو ایک کہانی سناتے اور کہتے "سنو عمران! امریکہ دریافت کرنے کے بعد جب کولمبس اپنا سفینہ لے کر وطن واپس لوٹا تو اس کے عملے میں شامل ایک قیدی عورت دوڑ کر ساحل پر اُتری اور بے تابانہ اپنی جنم بھومی کو بوسے دینے لگی۔ وطن کی محبت ایسا ہی طاقتور جذبہ ہوتا ہے بیٹا۔ وہ عورت میری آئیڈیل ہے اور میرے خیالوں میں بستی ہے۔ ہمیں اپنی اصل کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے عمران بیٹا۔"

عمران اپنے ڈیڈ کی باتیں سن کر مسکراتا اور انہیں ہمیشہ یاد رکھنے کا وعدہ کرتا۔

طارق کو باغبانی کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر پریوں کے ملبوس جیسے رنگوں والے خوبصورت Hybrid Tea Roses اُگاتے اور پھر انہیں کرسٹل کے گلدان میں سجا کر سراہتے رہتے۔ فیزی سے کہتے "دیکھو ڈیئر یہ گلاب کس قدر نازک، حسین اور دلکش ہیں مگر ان میں خوشبو نہیں ہے۔ ان کی نسبت میرے وطن پاک کے سادہ دیسی لال گلاب کی خوشبو یاد کرو کیسی مسحور کر دینے والی ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے فیزی۔۔۔۔ خدا نے یہاں کے گلابوں میں خوشبو کیوں نہیں ڈالی؟

فیری ایسی باتیں سن کر کھلکھلا کر ہنستی اور کہتی ''آپ نہیں سدھریں گے You are an incurable romanitc''

عمران ہائی سکول کے بعد کالج میں ایسے کورسز لینا چاہتا تھا جو اسے ایئروناٹک فیلڈ میں لے جانے میں مددگار ثابت ہوسکیں۔ اسے بچپن سے ہی خلاباز بننے کا بہت شوق تھا۔ اس کے والدین اس کے اس عزم میں اسے مکمل طور پر سپورٹ کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے ان کے پورے خاندان میں، جن میں امریکہ میں بسنے والے کئی بہن بھائی اور کزن رشتہ دار شامل تھے، کسی کے بچے نے بھی کبھی اس طرف جانے کی خواہش یا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔

''میں تو اس دن کے انتظار میں جی رہا ہوں کہ میرا بیٹا کسی بڑے ناسا مشن میں جائے اور کامیاب لوٹے۔ ایک آدھ ستارہ تو ہماری گود میں لا کر ڈال ہی دے گا نا'' طارق سوچتے اور پھر سارے گھر میں گنگناتے پھرتے ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں..... محبت مجھے ان جوانوں سے ہے، ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند'' عمران اپنے والد سے ان اشعار کا مطلب پوچھ کر مسکراتا اور ان کا یہ خواب پورا کرنے کا وعدہ کرتا۔

تھوڑی ہی دیر میں مہمان آنا شروع ہو گئے اور ہیلو ہائے، السلام علیکم کی ملی جلی آوازیں رنگین غباروں کی طرح فضا میں تیرنے لگیں۔ کمیونٹی کی معتبر شخصیات، قونصلیٹ کا عملہ، دوست احباب سب ایک دوسرے سے ہیلو ہائے کر رہے تھے اور حال احوال پوچھ رہے تھے۔ طارق تیس سال سے یو ایس اے میں ایک کامیاب کارپٹ ایکسپورٹر کے طور پر اپنی ساکھ قائم کر چکے تھے اور آج ان کے اکلوتے بیٹے کی گریجویشن پارٹی تھی۔ ایسا ہنگامہ تو ہونا ہی تھا۔

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' فیری کے گلے سے لگنے والی نرم کومل آواز والی خاتون بولی ''روزی تم؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے بھئی؟ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔'' فضیلہ مکمل طور پر برقع پوش خاتون کو دیکھ کر حیرت سے کہنے لگی ''کم آن روزی، ہمیں بتا دیا ہوتا تو ہم بھی فینسی ڈریس پہن کر آ جاتے۔''

فضیلہ اور روزی کی مشترکہ دوست رشمی ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔

''فار گاڈ سیک پلیز، تم دونوں خدا کا خوف کرو...... یہ فینسی ڈریس نہیں ہے۔ اب میں ہمیشہ اسی لباس میں رہتی ہوں۔ Now I am a born again Muslim. یو نو، اللہ تعالیٰ نے ہم عورتوں کے لیے یہی ڈریس کوڈ تجویز کیا ہے تو ہمیں اسی طرح رہنا چاہیے اور اب پلیز مجھے آئندہ سے روزی نہیں رضیہ کہہ کر بلایا کرو۔''

''اوہ آئی ایم سوری۔'' رشمی کچھ سمجھ کر سنجیدہ ہو گئی۔ فضیلہ بھی اپنی پرانی سہیلی کی اس بدلی ہوئی ہیئت کو دیکھ کر پل بھر کو تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی روزی ہے جسے لاس اینجلس کی لائٹ آف دی پارٹی کہا جاتا تھا۔ اس کی ڈرنکنگ، ڈانسنگ اور مردوں سے بے تکلفی کی داستانیں ویسٹ کوٹ سے نکل کر ایسٹ کوسٹ تک پھیل چکی تھیں۔ روزی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شرط لگا کر جس مرد کو چاہے اپنی طرف مائل کر سکتی ہے۔

''اچھا میں ذرا مغرب کی نماز پڑھ آؤں وقت نکلتا جا رہا ہے۔ ایکسکیوز می'' رضیہ اپنی سہیلیوں کو حیران پریشان چھوڑ کر گھر کے اندر چلی گئی۔

''کتنا چینج آ گیا ہے اس میں۔'' رشمی کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ نائن الیون تو ہماری جان کو ہی آ گیا ہے۔ جسے دیکھو اسلامک فنڈامنٹلسٹ بنتا جا رہا ہے یہاں۔ کیا ہوگا اس قوم کا۔''

''سب نے برقعے، حجاب اور عبائیں پہن لی ہیں۔ خدا خیر ہی کرے۔'' دونوں سہیلیوں نے روزی کی کایا پلٹ ہو جانے پر اپنے اپنے تبصرے شروع کر دیے۔

سوئمنگ پول کے اردگرد پارٹی زوروں پر چل رہی تھی۔ ڈیک سے موسیقی فل بلاسٹ پر لگی ہوئی تھی اور نوجوان لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ عمران کے ہم جماعتوں میں گورے، کالے، میکسیکن، چینی، ہسپانوی، ہر نسل کے بچے شامل تھے۔ خوش باش، کھاتے پیتے، مسکراتے بچوں کو دیکھ کر ان کے ماں باپ بھی خوش تھے کہ سب اتنا گڈ ٹائم انجوائے کر رہے تھے۔ کوئی پول میں نہا رہا تھا تو کوئی کسی کو پول میں گرا رہا تھا۔ کوئی میز پر تھرک رہا تھا تو کوئی تصویریں کھنچواتا ہوا پھڑک رہا تھا۔ عمران اپنے دوستوں کو آلو کے چپس اور سافٹ ڈرنکس پکڑاتا جا رہا تھا اور خوش تھا کہ وعدے کے مطابق اس کے تقریباً سبھی کلاس فیلوز پارٹی میں شریک ہونے کے لیے آ گئے تھے۔

''ماشاء اللہ بڑا پیارا نکل آیا ہے عمران بیٹا۔'' ایک آنٹی نے پاس آ کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیوں نہ ہو، آخر بیٹا کس کا ہے۔'' طارق احمد فخریہ انداز میں ہنس کر کہنے لگے۔

''ہاں ہاں جب کسی بات کا کریڈٹ لینا ہوتا ہے یہ آپ کا بیٹا بن جاتا ہے اور جب اس سے کوئی شکایت ہو تو یہ صرف میرا بیٹا ہوتا ہے۔'' فضیلہ مصنوعی غصے سے بولی تو طارق نے اپنی منہ بسورتی بیوی کے منہ میں آئس کریم کا چمچ ڈال دیا اور سب ہنسنے لگے۔

پارٹی اتنی زبردست تھی کہ کیونٹی میں ہفتوں اس کا چرچا ہوتا رہا۔ دور دور کی ریاستوں سے ان دوستوں نے جو بوجوہ شریک نہیں ہو سکے تھے مبارک باد کے فون کیے اور پارٹی مس کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے رہے۔ مگر تحفے بھجوانے میں کسی نے کنجوسی نہیں کی۔ عمران کے لیے چیزوں کا انبار لگتا چلا گیا اور فضیلہ اور طارق انہیں سمیٹتے لگتے۔ حالانکہ عمران کے پاس پہلے ہی بھلا کس چیز کی کمی تھی۔

گریجویشن کے بعد ایک لمبی موسم گرما کی تعطیل تھی اور پھر ستمبر میں کالج میں داخلہ ہونا تھا۔ مگر کچھ عرصے سے طارق اور فضیلہ محسوس کر رہے تھے کہ سمسٹر کے قریب آتے آتے عمران اپنے داخلے میں کوئی خاص دلچسپی کا اظہار کرتا نظر نہیں آ رہا۔ اس کی بھلا کیا وجہ تھی؟ عمران جیسا تعلیم پسند بیٹا نہ کالج کے پلانز بنا رہا تھا اور نہ ان سے اس بارے میں کچھ زیادہ ڈسکس کر رہا تھا۔

''عمران بیٹا! تم نے اپنے کاغذات مکمل کر کے یونیورسٹی کو بھجوا دیے ہیں نا؟'' ایک روز طارق نے اسے ناشتہ کی میز پر گھیر لیا۔

''ابھی نہیں ڈیڈ، میں آج کل ذرا کچھ مصروف ہوں۔'' عمران مزید کچھ کہے سنے بغیر اچانک کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈیڈ حیران ہو گئے۔

ایک روز ڈیڈ نے اسے پھر جا لیا ''دیکھو بیٹا! اگر تم نے واقعی خلا باز بننا ہے تو گھر بیٹھے تو نہیں بنو گے۔ اس کے لیے کالج تو جانا ہی ہوگا۔ پری کورسز کے بغیر ناسا پروگرام میں کیسے داخل ہو گے، سمجھ آ رہی ہے یا نہیں؟'' طارق کا لہجہ کرخت ہو گیا۔

فضیلہ نے شوہر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی کہ اتنا غصہ نہ دکھائیں۔

''بیٹا ڈیڈ کہہ رہے ہیں، کچھ سنا تم نے یا نہیں؟''

ماں نے پیار سے بیٹے کے آگے چکن کا پیس رکھتے ہوئے پوچھا۔

''مام، ڈیڈ! میں آپ دونوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' عمران کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی چھا گئی۔ ''دراصل میں فی الحال آگے نہیں پڑھنا چاہتا۔'' کمرے میں ایک بم سا پھٹا اور در و دیوار لرزنے لگے۔

''کیا کہا؟ واٹ نان سینس۔ کیوں نہیں پڑھنا چاہتے۔ پڑھو گے نہیں تو کرو گے کیا؟ یہ کیا امریکن بچوں والی بات ہے؟ ہائی سکول نہ کالج ختم کیا۔ کوئی Odd job کر لی۔ گیس سٹیشن پر گیس بھری Hourly wages پر کام کیا، پھر Quit کیا۔ نہ کوئی تعلیم نہ تربیت، نہ کوئی مستقبل کا منصوبہ۔'' طارق غصے سے چیخنے لگا۔

''بیٹا ہم امریکنوں جیسی حرکتیں نہیں کر سکتے۔ ہم ایشین لوگ ہیں، ہم لوگوں کے زندگی میں Goals ہوتے ہیں، پلانز ہوتے ہیں، ہم اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے۔'' فضیلہ تحمل سے بات کرنے لگی۔

''آپ لوگ ایشین ہیں میں نہیں۔ میں امریکن ہوں۔ کیونکہ میں اسی سرزمین میں پیدا ہوا ہوں۔ آپ مجھے اپنی طرح سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔'' عمران پورے اعتماد سے ماں باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''ہائے اللہ پڑھو گے نہیں تو کرو گے کیا؟ باہر گھوم پھر کر آوارہ گردی؟ امریکن بچوں کی طرح، شراب، ڈرگز، بدکاری، ان لوگوں کا تو نہ ماں ہے نہ باپ۔ مگر تم ہمارے بیٹے ہو۔ ہم تمہیں یوں بگڑنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔'' فضیلہ بھی چیخنے لگی۔

''میں آوارہ گردی نہیں کروں گا مام'' عمران نے اسے پیار سے چھوا۔

''تو کیا کرو گے گھر بیٹھ کر؟'' طارق نے فضیلہ کی طرف دیکھ کر سر پکڑ لیا'' مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ صاحبزادے کے ارادے کیا ہیں؟''

''میں شادی کروں گا، مام ڈیڈ'' عمران بڑے اطمینان سے بولا۔

''شادی؟ یہ شادی بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ ابھی شادی کا کیا ذکر۔ ابھی تو تم بچے ہو۔ بیٹا عقل کرو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ شادی بھی وقت آ جانے پر ہو جائے گی۔ یہ وقت تمہاری تعلیم کا ہے۔'' فضیلہ نے پیار سے کہا۔

''کون ہے وہ؟ ڈاکٹر عنایت کی بیٹی نادیہ تو نہیں؟'' فضیلہ نوٹ کر رہی تھی کہ کچھ دنوں سے اس کے کافی فون آ رہے ہیں۔

''نو مام، وہ تو صرف میری دوست ہے۔'' عمران کچھ نروس سا نظر آنے لگا۔

''تو پھر؟ ہائے کہیں کوئی امریکن لڑکی تو نہیں؟'' فضیلہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

''کیا پاکستانی لڑکیوں کی کوئی کمی ہے امریکہ میں؟'' فضیلہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''ملوا دوں گا آپ لوگوں سے اسے...... آج ہی شاید...... مام ڈیڈ! آئی ایم سوری، آپ کو دکھ ہوا لیکن بس میں اب کیا بتاؤں۔ مینڈی اور میں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بہت پیار ہے ہمیں ایک دوسرے سے۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ'' عمران ماں باپ کو حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ سوچنے لگے جب ہیروشیما پر ایٹم بم گرا تھا تو کیا اس شہر کے باسی بھی اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے راکھ کی ڈھیریوں میں تبدیل ہو گئے تھے؟

''کیا ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے فیزی؟'' طارق نے بچوں کی طرح روتے روتے فضیلہ کی گود میں سر دے دیا اور وہ خاموشی سے اسے تھپکا کر اپنے آنسو

پوچھنے لگی۔

اگلے چند دن کچھ عجیب سی خاموشی میں کٹے۔ عمران صبح سویرے نکل جاتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔ نہ جانے کہاں رہتا تھا وہ؟ ماں باپ سے بھی کم ہی ملاقات ہوتی۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اسے؟ فضیلہ اُٹھتے بیٹھتے اس امریکن چڑیل کو کوسنے اور بددعائیں دیتی رہتی۔ جس نے اس کے معصوم بیٹے پر جادو کر دیا تھا۔

''فیری! ٹیک اِٹ ایزی۔ کیا پتہ وہ اچھی لڑکی ہو۔ شاید وہ ہماری بیٹی بن جائے۔ آخر ہماری کوئی بیٹی بھی تو نہیں ہے۔ شاید اس میں خدا کی کوئی مصلحت چھپی ہو۔ آخر ہم اپنا اکلوتا بیٹا کھونا تو نہیں چاہتے نا۔'' طارق بیوی کو سمجھاتے رہے۔

''ہیلو مام ڈیڈ!'' عمران نے ایک شام گھر میں گھستے ہی انہیں پیار سے مخاطب کیا اور پھر کسی کو دروازے کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ کر آواز دی ''مینڈی، اندر آ جاؤ...... ڈونٹ بی شائی'' چند لمحے مکمل خاموشی رہی۔ پھر عمران اُٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ فضیلہ اور طارق کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کالی لمبی تڑنگی لڑکی کو انہوں نے عمران کی گریجویشن پارٹی میں دیکھ تو رکھا تھا لیکن شاید زیادہ قریب سے نہیں۔ کیونکہ موٹے موٹے ہونٹوں، بڑی بڑی آنکھوں اور پیٹ کے نمایاں اُبھار والی آبنوسی لڑکی کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ فضیلہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور اس نے کرسی تھام کر لمبے لمبے سانس لینا شروع کر دیے۔

''کیا تم؟'' فضیلہ نے مینڈی کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے سوال بیچ ہی میں چھوڑ دیا۔

''یس...... چار مہینے ہونے والے ہیں۔'' مینڈی نے اپنے پیٹ کی طرف فخر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مینڈی کے جانے کے بعد گھر میں بھونچال سا آ گیا۔ ڈیڈ چیخ رہے تھے۔ مام زار زار رو رہی تھی اور عمران گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

''ہم نے تمہیں کیا نہیں دیا؟ تمہاری ہر فرمائش پوری کی...... پھر تم ہمارے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتے ہو؟''

''ڈیڈ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم نے جان بوجھ کر تو بے بی پلان نہیں کیا تھا۔ بس ہو گیا۔ یو نو It Happens......'' عمران نے کندھے اُچکائے۔

''مینڈی بہت تنہا تھی۔ جیک کے ساتھ اس کا بریک اپ ہوا تو میں نے ہی اسے سنبھالا تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ ملیں گے تو خود ہی دیکھ لیں گے۔''

''بے شرم لڑکے یہ ہمارا کلچر نہیں ہے۔'' ماں تڑپ کر بولی۔

''مام یہ اس ملک کا کلچر ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ میں امریکن ہوں۔ یہاں کا رہنے والا ہوں۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ ہم ایشین بچوں پر اس سوسائٹی میں کتنے پریشرز ہوتے ہیں۔ جوان ہونے کے بعد ہم اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ کیسے ہو جائیں۔ اگر ہم کسی کے ساتھ ڈیٹنگ نہ کریں تو ہمیں ابنارمل یا ''گے'' سمجھ لیا جاتا ہے اور اگر اپنے فرینڈز کی طرح امریکن لائف گزاریں تو آپ لوگوں کی ویلیوز خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ ہم لوگ اس سوسائٹی میں رہ کر مس فٹ نہیں ہونا چاہتے۔ یہ ہمارے سروائیول کا مسئلہ ہے۔ سمجھنے کی کوشش کریں۔ اب ہمیں یہاں رہنا ہے ہمیشہ اور مستقلاً مت روکیں۔'' عمران کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''ایک غلام زادی اب ہماری بہو بنے گی۔'' فضیلہ نے دانت پیسے۔

امریکی آسائشوں اور معاشی آسودگیوں کے غلام، تیسری دنیا کے تارک وطن، بے بسی کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور لہریں اونچی سے اونچی ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

فضیلہ کو اپنی ایک پرانی امریکن ہمسائی یاد آ گئی جس نے اپنے بیٹوں کے لیے گھر میں پلے بوائے میگزین لگوا رکھا تھا۔ ''تم اپنے بیٹوں کو خود ہی کیوں بگاڑ رہی ہو؟'' ایک بار فضیلہ نے اس سے سوال کیا تو اس کے جواب نے فضیلہ کو حیران کر دیا۔

''میں نے یہ اس لیے لگوایا ہے کہ میرے بیٹے لڑکیوں کی جگہ لڑکوں میں دلچسپی نہ لینے لگیں۔''

طارق اور فضیلہ کی پاکستانی کیونٹی کے لوگ حیران تھے کہ اتنی پیاری فیملی کو کس کی نظر کھا گئی۔ سب کچھ اچھا بھلا تو تھا۔ چند ماہ پہلے ہی تو اتنی عالی شان گریجویشن پارٹی دی تھی انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے اور اب یہ اچانک شادی کا دعوت نامہ!

فضیلہ نے رو رو کر پہلے ہی سب دوستوں کو بتا دیا تھا کہ ان کے بیٹے سے ایک غلطی ہو گئی ہے اور اب وہ اسے باعزت طریقے سے نبھانا چاہتے ہیں۔ راز تو شادی کے دن کھل ہی جانا تھا ''شیطان کا کیا ہے کسی بھی وقت کسی کے بچے کو بھی بہکا سکتا ہے۔'' ان کے بچے کو بھی بس شیطان نے بہکا دیا تھا۔

ساری کیمونٹی میں ایک شادی پارٹی ہونے کے خیال سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خواتین اپنے نئے پاکستان سے منگوائے ہوئے جوڑے پہننے کے خیال سے جھوم اُٹھیں اور نوجوان لڑکے، لڑکیاں مہندی کے فنکشن پر ناچنے گانے کے خیال سے پروگرام سیٹ

کرنے لگے۔

فضیلہ اور طارق نے سوچا اب سر پر پڑ ہی گئی ہے تو کیوں نہ اسے خوبصورتی سے نبھائیں۔ انہوں نے دولہا دلہن کے لیے نئے سرے سے بیڈروم کوری ماڈل کیا اور لاہور سے دلہن کے لیے ڈیزائنر عروسی جوڑے آرڈر کر دیے۔ طارق کی بہن زبیدہ نے کپڑے تو بھجوائے تھے مگر چونکہ اسے دلہن کی اصلی صورت حال نہیں بتائی جا سکتی تھی لہٰذا لہنگا شلوار ٹخنوں سے اونچی اور قمیض کمر سے تنگ رہی۔

شادی والے دن آبنوسی رنگت والی دلہنیا کو لال جوڑے میں لاکھ سجایا مگر وہ کسی بھی طرح پاکستانی دلہن نہ لگ سکی۔ کرتے کی سلائیاں سائیڈ سے نکال دی گئیں مگر پھر بھی اس کا پیٹ گیند کی طرح باہر کو اُبلتا دکھائی دیتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے سیاہ بالوں کے چھتے پر دوپٹہ ٹکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بالوں کو ہر طرف سے لاکھ کلپ لگائے گئے تب کہیں جا کر دوپٹہ سر پر ٹھہرا اور ساس کی جان میں جان آئی۔

"تم ایک بہت بڑی نیکی کا کام کر رہی ہو فضیلہ بہن۔ اللہ تمہیں اس کا بہت اجر دے گا۔" چہرہ چھپائے ہوئے رضیہ عرف سابقہ روزی نے فضیلہ کو گلے لگا کر پیار کیا تو فضیلہ آنے والی زندگی میں ملنے والی دودھ اور شہد کی نہروں کے کنارے بیٹھ کر ستانے کے خیال سے مسکرا دی۔

دونوں سہیلیاں دلہن کو سرخ دوپٹہ اُٹھا کر دھیرے دھیرے باہر لائیں تو مینڈی کی باسکٹ بال پلیئر سہیلیوں نے مسکرا کر تالیاں بجائیں اور آگے بڑھ کر اس کا دوپٹہ اور لہنگا اُٹھا اُٹھا کر اس پر ہونے والا کام دیکھنے لگیں۔ انہیں مینڈی کے کپڑے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

"Give me a joint" مینڈی نے اپنی ایک دوست لنڈا کو قریب پاتے ہی اس سے ایک سگریٹ لیا اور زور زور سے کش لینے لگی۔

"You look stressed" لنڈا نے پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا تو مینڈی نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

"بہت تھک گئی ہے مینڈی" عمران نے اسے دور سے دیکھا تو اس کے قریب جا پہنچا اور مینڈی کی فرینڈز سے اپنی شیروانی آؤٹ فٹ پر داد سمیٹنے لگا۔ مینڈی نے اپنے پیٹ پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہنے لگی "Baby! look, your dad is looking so handsome"۔

عمران بہت خوش تھا۔ آخر اس کے ماں باپ اس کی خوشی کے لیے راضی ہو ہی گئے اور اب تو ان سب کی لگی بندھی روٹین لائف میں ایک خوشگوار تبدیلی بھی آنے والی تھی۔ گھر کے آنگن میں ایک نئے پھول کی مہک پھیلنے والی تھی۔ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے پیارے ماں باپ کا منہ چوم لیے۔

مینڈی کو پہلے مسلمان کر کے منزہ بنایا گیا۔ اسلامی نام رکھنے کا ایک اہم مرحلہ طے ہو گیا۔ جوان جہان کالی داڑھی اور شرارتی نظروں والے امام صاحب دلہن کے پیٹ کو مستقل گھورتے رہے۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

"فیزی! یہ تم نے بڑا نیکی کا کام کیا ہے۔ ایک غیر مسلم کو مسلمان بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی بہت جزا دیں گے۔" رضیہ نے پھر سے فیزی کے کان میں سرگوشی کی تو فضیلہ پھیکی سی مسکراہٹ سے ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

بہو کے آ جانے سے فیملی کے روز و شب میں کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ منزہ بیٹی اور عمران بیٹے کے باہر آنے جانے کے اپنے اوقات اور طور طریقے تھے۔

فضیلہ کئی بار سوچتی کہ بیٹے کی شادی صحیح وقت پر اور کسی پاکستانی لڑکی سے کی ہوتی تو وہ بہو کے کتنے چاؤ پورے کرتی۔ مگر یہاں تو اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بہو کے ساتھ کیسے پیش آئے۔ منزہ کھلاڑی لڑکی تھی۔ اس لیے جسمانی فٹنس کا پورا خیال رکھتی تھی۔ چند ہی ماہ بعد اسے کسی باسکٹ بال میچ میں شرکت کرنا تھی جسے وہ کسی قیمت پر بھی مس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ہر وقت ورزش کرتی۔

فضیلہ اسے پاکستانی کام والے زرق برق جوڑے پہنا کر فرینڈز کے گھروں میں دعوتوں پر لے جاتی تو وہ بہت انجوائے کرتی۔

اتنی محبت کرنے والا شوہر اور خدمت گار ساس ملی تھی۔ وہ تو ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا تو خیال تھا وہ اپنے بچے کو سنگل پیرنٹ بن کر پالے گی یا اپنی ماں کی مدد طلب کرے گی جو خود بھی ہمیشہ تنہا رہی تھی۔ مگر یہاں تو سب کچھ اتنا مختلف اور اچھا تھا کہ لائف ونڈرفل ہو گئی تھی۔ اب نہ اسے گھر کے کرائے کی فکر تھی نہ کمانے کی ٹینشن۔ بے بی کے لیے بھی سب انتظامات خود بخود ہوتے چلے جا رہے تھے۔

فضیلہ کو ایک فکر دن رات کھائے جا رہی تھی کہ اگر بچہ ماں پر چلا گیا تو پھر کیا ہو گا۔ وہ دن رات جائے نماز پر بیٹھی خدا سے التجائیں کرتی کہ "اے اللہ پاک! میرے پوتے کو ماں جیسے موٹے بھدے نین نقش اور کالے چھتے جیسے پھولے بال نہ دینا۔ یا اللہ! ہمارے حال پر رحم کرنا۔ بچہ بے شک عمران جیسا نمکین ہو مگر اسے نقش پاکستانی دینا۔" فضیلہ نے بہو کے کمرے میں جا بجا خوبصورت پاکستانی بچوں کی تصویریں سجا دی تھیں تاکہ وہ ہر وقت انہیں دیکھتی رہے اور ویسا ہی خوبصورت بچہ پیدا کرے۔

عمران بڑے شوق سے اپنی بیوی کو میڈیکل

چیک اپ کے لیے لے جاتا اور اس کی صحت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا۔ ہر ماڈرن امریکی جوڑے کی طرح ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچے کی پیدائش کے مرحلے میں ایک دوسرے کے مددگار اور معاون ثابت ہوں۔ اس لیے انہوں نے ان کلاسوں میں بھی جانا شروع کر دیا جہاں مرحلہ پیدائش کے دوران حاملہ ماؤں کو تنفس کے ذریعے آسان برتھ کی تربیت دی جاتی۔

''مام ڈیڈ! جب میں پیدا ہو رہا تھا تو آپ لوگ بھی بہت ایکسائٹڈ ہو رہے ہوں گے۔ ہیں نا؟''

عمران نے اپنی بیوی کے لیے بنائی گئی لذیذ پنجیری اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا ''کتنا مزے کا ہے یہ!'' مینڈی بولی۔

''ہاں بیٹا! لیکن اب یہ بھی سوچو کہ تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے..... خلا باز بننا ہے۔'' ڈیڈ نے اس کا وعدہ اور فرض یاد دلایا۔

''کروں گا کروں گا۔ سب کچھ کروں گا۔ آپ کے سب خواب پورے ہوں گے۔ آخر آپ میرے اتنے پیارے مام ڈیڈ ہیں۔ آپ کی سپورٹ نہ ہوتی تو میں زندگی کے اس حسین لمحے میں کتنا اکیلا رہ جاتا۔ تھینک یو.....''

منزہ بھی فرطِ مسرت سے ساس سے لپٹ کر بولی ''یو آر دا بیسٹ۔''

فضیلہ کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ ہائے کاش یہاں کوئی پاکستانی لڑکی ہوتی۔ خوبصورت، نازک اندام، پتلے پتلے نین نقش والی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

''مام کتنی اچھی بات ہے کہ منزہ اتنی خوش ہے۔ ہم سب کو اسے خوش ہی رکھنا چاہیے۔ آپ لوگ بھی خوش ہیں نا کہ یہ بچہ اس دنیا میں آ رہا ہے؟''

طارق اور فضیلہ بیٹے کی معصومیت پر مسکرا دیے

''ہاں بیٹا! ہم خوش اور بہت خوش ہیں۔ ہماری تنہائیاں دور ہو جائیں گی، گھر میں رونق ہو جائے گی، بڑا مزا آئے گا۔'' طارق بچوں کی طرح خوش ہو کر بولے۔

''میں نے اسلامی ناموں کی کتاب سے نام بھی چننے شروع کر دیے ہیں۔'' فضیلہ نے اترا کر کہا ''رحمٰن کیسا رہے گا؟''

''اچھا ہے، سویٹ ہے، لیکن ہم اسے Raymond رجسٹر کروائیں گے۔ مام ڈیڈ کے لیے رحمٰن رہے گا۔ ٹھیک ہے نا؟'' منزہ خوش ہو کر بولی۔

''گریٹ آئیڈیا ہنی! اس طرح اسے کوئی مسلم دہشت گرد نہیں سمجھے گا۔'' عمران نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

یوں تو بہو کی ہر طرح سے دیکھ بھال کی جا رہی تھی۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیسے ایک روز غسل خانے میں اس کا پاؤں پھسل گیا اور اُسے اُس وقت سے پہلے ہی دردیں شروع ہو گئیں۔ سب اسے لے کر بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے اور فوراً داخل کروا دیا۔ عمران اندر جا کر بیوی کو لاماز کی ورزشیں کروانے لگا اور فضیلہ نے تسبیح پکڑ کر خدا سے بچے کے صحت مند اور خوبصورت ہونے کی دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ طارق بھی نروس ہو کر ہسپتال کے کاری ڈور میں گھومنے لگے اور خدا سے یہ مرحلہ بخیریت طے ہونے کی دعا کرنے لگے۔ کئی گھنٹوں کی سخت لیبر کے بعد یکا یک عمران بھاگا بھاگا باہر دوڑ آیا۔ ''مام ڈیڈ! آ جائیں بے بی از ہیئر''

''اچھا؟ کیا ہوا ہے؟'' طارق نے بے چینی سے پوچھا۔

''تم نے دیکھا اسے؟'' فضیلہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''نرس نے بس یہ بتایا ہے کہ لڑکی ہے۔ بہت پیاری ہے جلدی چل کر دیکھتے ہیں۔'' عمران کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

''او ہو تو اب رحمٰن کا نام بدلنا ہوگا..... کیا رکھوں گی؟'' فضیلہ نے جلدی جلدی سوچا ''چلو رحمٰن نہ سہی ریما ہی سہی، ٹھیک عمران!''

''آپ کی جو مرضی مام..... یہ آپ پر چھوڑ رہا ہوں۔'' عمران بولا۔

ذہن میں بہت ساری سوچیں جنم لینے لگیں۔ کاش لڑکی کا نام بھی پہلے ہی سوچ لیا ہوتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تینوں بے چینی سے منزہ کے پاس چلے آئے۔ فضیلہ نے بہو کے ماتھے پر بوسہ دے کر بسم اللہ پڑھی اور چھوٹی پلنگیا میں لیٹی بے بی کو پیار سے اُٹھا لیا۔

''ریما جانی آنکھیں کھول دو.....'' عمران، فضیلہ اور طارق نے سوئے ہوئے ننھے فرشتے کو دیکھا اور اس پر سے کپڑا ہٹا دیا۔

''میرے اللہ! اس قدر خوبصورت بچی'' سب حیران ہو کر وہیں جمے کے جمے رہ گئے۔ لچھے دار سنہری بالوں، گوری گلابی رنگت اور نیلی سمندر آنکھوں والی حسین باربی گڑیا گود میں آتے ہی بھوک کے مارے اوں اوں کرنے لگی۔ فضیلہ کو تو جیسے کرنٹ سا لگ گیا۔ اس نے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا کر نفرت سے یوں منہ پھیر لیا جیسے اس نے اس سے پہلے کبھی اتنی بدصورت بچی نہ دیکھی ہو۔

✧✧✧

بڑا فن کار

انجینئر ظفر محی الدین

میں سادہ لوح، بھولا یا بے وقوف نہیں ہوں جیسا کہ لوگوں کا میرے بارے میں گمان ہے۔ البتہ مجھ میں یہ خرابی ضرور ہے کہ میں اُن سے جانتے بوجھتے دھوکہ کھاتا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس معاملے میں بچپن سے ہی میں ایسا ہوں۔ ہم عمر بچے جب کھیل کود کے دوران لگی لپٹی باتوں سے میری چاکلیٹ کھا جاتے تھے تو میں نے کئی بار اپنی عدم موجودگی میں انہیں ہنستے اور مذاق اُڑاتے دیکھا وہ کہہ رہے ہوتے تھے کہ آج اُسے کیسا بے وقوف بنایا ہے جبکہ ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ مجھے اُن کے خوشامدانہ رویّے اور چالاکیوں کا پہلے سے علم ہوتا تھا۔ میرے پاس جیب خرچ وافر ہوتا تھا تو میں اُن کے لیے علیحدہ سے چاکلیٹ ٹافیاں اور بسکٹ لے لیا کرتا تھا۔ اس طرح انہوں نے مجھے سادہ لوح جان کر میرے کافی کھلونوں پر ہاتھ صاف کیا، جبکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ویسے بھی وہ کھلونے میں نے اُن کو دے دینے تھے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو ابو میرے لیے بہت زیادہ کھلونے لاتے تھے۔ پھر سالگرہ پر بھی کھلونوں کا انبار لگ جاتا تھا۔ کھلونوں کے حوالے سے میں بہت زیادہ کریزی بھی نہیں تھا، جیسا کہ بچے عموماً ہوتے ہیں۔

سکول میں کلاس فیلوز اکثر اسٹیشنری کے سامان میں سے چیزیں چرا لیتے تو مجھے اُس کا بھی علم ہوتا کہ کس نے کب کون سی چیز چرائی ہے۔ لنچ بکس پر ہمیشہ اُن کی نظر ہوتی۔ کیونکہ اُس میں میری امّی نے بڑے مزے کے سینڈوچ، پیٹیز یا فروٹ چاٹ بنا کے رکھی ہوتی۔ میں یہ سب بخوشی اُن سے شیئر کرتا لیکن کبھی کبھی اُن کی کمینگی حد سے بڑھ جاتی اور مجھے بھوکا رہنا پڑتا۔ میں اس بھوک کو بھی انجوائے کرنے لگ گیا۔ میرے اندر بچپن سے ہی فطری درویش پوشیدہ تھا۔ البتہ مجھے اس وقت دکھ ضرور ہوتا، جب وہ اپنی چالاکیوں اور مکاریوں پر اتراتے ہوئے میرا مذاق اُڑا رہے ہوتے کہ آج کیسا بے وقوف بنایا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ میں اس کا بھی عادی ہو گیا اور اب پچاس برس کی عمر میں جب یار دوست یا کوئی بھی ایسا شخص جس نے مجھے داؤ لگایا ہو اور بعد میں مجھے بھولا سمجھ کر شیخیاں بگھاڑ رہا ہو تو مجھے اُس کی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔

سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک بھی یہی معاملہ رہا۔ ہاسٹل میں کمرے کے کولیگ نے مجھ سے جھوٹ بول کر کافی کام لیے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے میں اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اُس کے کام کرتا رہا۔ کئی بار اُس نے بیماری کا بہانہ بنا کر اپنے کپڑے استری کروائے۔ بازار سے سامان منگوایا اور بل تک ادا نہیں کیا۔ جذبۂ ہمدردی اور گھریلو تربیت کے باعث میں خاموش رہا۔ کچھ عرصہ بعد دوستوں نے بتایا کہ وہ تمہیں پرلے درجے کا بے وقوف سمجھتا ہے۔ میرے لیے یہ جملہ کوئی نیا نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح میری ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان بکھری جو بغیر کسی اندرونی تکلیف کے ختم ہو گئی۔ بلکہ اب تو مجھے اس جملے سے راحت ملنے لگی تھی۔

کھیل کا میدان ہو یا شطرنج کی بساط، دفتر کے کولیگز ہوں یا رشتہ دار اُن میں سے بیشتر کا رویّہ میرے ساتھ ایسا ہی رہا لیکن ان میں سے چند ایک ایسے بھی تھے جو میرے بارے میں نیک گمان رکھتے تھے۔ مجھے فرشتہ صفت انسان سمجھتے اور میرے وجود کو فی زمانہ غنیمت گردانتے تھے۔ جب وہ میرے سامنے ان باتوں کا اظہار کرتے تو پہلے پہل مجھے شرمندگی ہوتی تھی اور بعد میں اذیّت ہونے لگی تھی۔

ان لوگوں میں سے بیشتر نے قرض رقم لی اور کبھی واپس نہیں کی۔ ایک دو سے میں نے اپنے مزاج کے خلاف سختی سے تقاضا کیا تو انہوں نے ایسی باتیں کیں کہ اُلٹا مجھے اذیت ہوئی۔ پھر انہوں نے خود ہی یک طرفہ طور پر رابطہ بھی ختم کر دیا۔ میں نے باقی مقروض دوستوں سے تعلق بچانے کے لیے ان سے قرض کی رقم کا کبھی مطالبہ نہیں کیا اور نہ ہی ان کو یہ احساس ہونے دیا کہ اس بارے میں اُن سے میں کبیدہ خاطر ہوں۔ البتہ ان میں سے کچھ دوستوں نے مجھ سے پہلے رقم اُدھار لے رکھی تھی جب مزید رقم اُدھار لینا چاہی تو دل پہ جبر کرتے ہوئے میں نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ مجھے حدیث یاد تھی کہ ''مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔''

جب کسی نے گاڑی مانگی، میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے چابی اُس کے حوالے کر دی اور ہر بار مجھے اُس کے بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑا لیکن آج تک مجھ سے انکار نہ ہو پایا۔ ظاہر ہے کوئی ضرورت کے تحت ہی کسی سے کچھ مانگتا ہے۔ ہاں ایک بار مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ ایک دوست گاڑی لے کر گیا، ابھی وہ گاڑی خریدے مجھے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ وہ اس میں واش روم کی ٹائلز بھر کر لے آیا۔ حالانکہ اس کے لیے اُسے Pic up کرانے کی ضرورت تھی۔ چند روپوں کے لیے اُس نے میرا ہزاروں کا نقصان کر دیا۔ اُس دن میرے ہونٹوں پر ہنسی نہیں آئی۔

جب نقصان حد سے بڑھنے لگے تو کبھی کبھی اب مجھے گمان ہونے لگتا کہ میں یا تو بہت سادہ ہوں یا نادان ہوں اور لوگوں کی رائے میرے بارے میں بالکل درست ہے اس کے باوجود میں اپنی دریا دلی کی یہ عادت ترک نہ کر پایا اور راحت اور اذیّت کے مرحلوں سے آئے روز گزرتا رہا۔ پھر ایک روز مجھے خیال آیا کہ کب تک میں اس امتحان سے خود کو گزاروں گا۔ کیونکہ نہ بابا جی سے پوچھا جائے۔ اگلے روز میں نے گاڑی نکالی اور سیدھا بابا جی کے حجرے پر پہنچ گیا۔ جو میرے پیرومرشد تھے اور ہر معاملے میں میری رہنمائی کرتے تھے۔ میں نے جب ان سے ساری کیفیت بیان کی اور چند واقعات سنائے تو اُن کے چہرے پر ویسی مسکراہٹ پھیل گئی جو معصوم بچے کی دلچسپ بات سن کر والدین کے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔

پھر انہوں نے نہایت سنجیدگی سے میرا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا بیٹا! تمہارے اندر بڑا فن کار چھپا ہوا ہے۔ جو لوگ جانتے بوجھتے دھوکے کھاتے ہیں۔ اُن کے اندر ہی یہ بڑا فن کار ہوتا ہے۔ تم اپنے اس فنکار کو کبھی مرنے نہ دینا۔

افسانہ

درویش

محمد شفیق

حیات بچپن سے ہی متین مزاج اور خاموش طبع واقع ہوا تھا بچپن کے ایام میں والدین اور رشتہ دار اس کی بھولی بھالی صورت اور فربہ شخصیت سے بہت زیادہ مانوس تھے اور یوں وہ پورے خاندان کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا اور اسکی معصوم اور حسین اداؤں کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا کہ جیسے سیب انناس اور پپیتے کا رس یکجا ہو گیا ہو۔ ہر بچپن کے رخصت ہونے کی طرح حیات کا بچپن بھی کئی خوبصورت اور دلفریب یادوں اور تصویروں کے ساتھ رخصت ہو گیا اور پتہ ہی نہ چلا کہ کب حیات کی جگہ اسکے چھوٹے بہن بھائیوں نے لے لی۔ حیات کی جوانی، جوانی تھی۔ دراز قد، چوڑا سینہ خوبصورت موٹی موٹی آنکھیں صاف شفاف چہرہ فربے فربے ہاتھ پاؤں خوبصورت موتیئے جیسے چمکدار دانت اور پھر حسین شباب میں سفید چہرے پر چھوٹی چھوٹی گھنگھریالی داڑھی نے گویا چاند زمین پر اتار دیا تھا۔ حیات لڑکپن میں سکول کے انتہائی ذہین بچوں میں شمار ہوتا تھا میٹرک امتیازی پوزیشن میں کرنے کے بعد حیات نے ایف۔ ایس۔ سی۔ میڈیکل گروپ میں داخلہ لیا مگر اس وقت تک اسکی انوکھی، مذہبی اور غیر متوقع عادات سے سب شاکی ہو چکے تھے۔ حیات اپنے والد کی سب سے بڑی اولاد تھی اور اس حوالے سے حیات کا والد اس سے کئی امیدیں لگائے بیٹھا تھا جن میں سب سے بڑی امید یہ تھی کہ تم نے ڈاکٹر بننا ہے جبکہ حیات نہ صرف مستقبل کے خوابوں سے دور تھا بلکہ وہ تو جیسے اس مادی زندگی سے بھی بیزار تھا اکثر تعلیمی سرگرمیوں میں عدمِ دلچسپی کی وجہ سے والد اور حیات کے درمیان بحث مباحثہ ہوتا رہتا تھا حیات کا والد ایک مادیت پرست انسان تھا جو ظاہری دنیا کے عروج کو ہی انسانیت کی معراج سمجھتا تھا جبکہ حیات روحانی زندگی اور مذہبی اقدار کو انسانیت کا عروج اور بقائے دوام سمجھتا تھا۔ حیات نے اکثر اوقات تعلیمی اخراجات بھی مذہبی اخراجات کی نذر کر دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف اس کے گھر والے بلکہ خاندان کے لوگ بھی اس جدید دنیا میں حیات کے ان کاموں کو نہ صرف اسکے دقیانوسی خیالات سمجھتے بلکہ ان امور پر اس پر جی بھر کے ٹھٹھہ مزاق بھی کرتے لیکن حیات ان باتوں کی کدورت کو بھی اپنی دلفریب مسکراہٹ میں اڑا دیتا۔ بلکہ اکثر اوقات تو یہاں تک بھی کہہ دیتا کہ تمہیں معلوم ہو جائے گا ابھی اس کا وقت نہیں۔ مگر ہنسنے والے اس کی ان باتوں کو بے مقصد اور بے فائدہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ حیات نے اپنے پرائے ہر انسان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا ہوا تھا اور دوسری غیر متوقع باتوں کی طرح کئی بار اپنے خاندان والوں سے اس بات پر طنز کا نشانہ بنا کہ بیگانوں کے درد اور کام تم نے اتنی ذمہ داری سے اُٹھائے ہوئے ہوتے ہیں جتنا اپنے کام کاج سے دور ہو۔ حیات ان باتوں پر کبھی تو خاموش ہو جاتا اور کبھی صرف ایک ہی جملہ کہہ دیتا تمہیں پتہ چل جائے گا حیات کو اکثر اوقات مختلف بزرگوں کے مزارات پر بھی حاضری دیتے دیکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ حیات اب سکون کی گولیاں لے کر کئی کئی دن تک سویا رہتا جس کی وجہ سے خاندان والے اس پر کئی کئی جملے کستے مگر اسے کسی کی کوئی پرواہ ہی نہ تھی وہ اپنی من کی دنیا میں بڑا امیر کبیر انسان تھا اکثر اوقات اپنے جیب سے بھی خفیہ طور پر محلے اور شہر کے غریب غرباء لوگوں کی مدد کر دیتا تھا، اور بہت زیادہ ہوتا تو انہیں صرف یہ کہہ دیتا کہ میرے خاندان والوں سے اس کا ذکر نہ کرنا اور یہ بات سن کر لوگ اس سے یقین دلا دیتے کہ ہمیں اپنی مدد سے مطلب ہے نہ کہ ڈھنڈورا پیٹنے سے، حیات ہمیشہ خوش اخلاق ملنسار اور ہمدرد انسان کے روپ میں ہی نظر آتا تھا اور کبھی کبھی تو دوسروں کے دکھ کی خاطر اپنے آرام سکون اور روپے پیسے کو بھی داؤ پر لگا دیتا تھا۔ حیات کی طبع جولانی میں بلا کی روانی تھی انکی زندگی اس بات کا آئینہ تھی کہ وہ کبھی تشکیک کی زد میں نہیں آئے صداقت پر ان کا ایمان پختہ تھا۔ حیات کا اپنا ایک خاص انداز تھا اور یہ منفرد سٹائل ہی انکی پہچان تھا۔ منفرد انداز سوچ اور مشاہدہ تھا ان میں بے ساختگی اور قدرتی پن تھا انکا ط[illegible] اور بلیغ ہوتا تھا۔ حیات زندگی بھر تدبیر اور تحقیق کی تلاش میں رہے ہمیشہ دوسروں کو صداقت پر ابھارتے رہے اور یہ سب عوامل عیاں کرتے ہیں کہ حیات ایک درویش صفت انسان تھا اور قلندرانہ فکر کا حامل تھا کیونکہ جہان تازہ کی افکار تازہ سے نمو ہوتی ہے۔، جب آپ کو یقین ہو جائے کہ آپ نے اپنے مقاصد کا تعین کر لیا ہے پھر اس وقت ان کے حصول کیلئے تن من دھن کی بازی لگنے کا مرحلہ آتا ہے اور اسی

کا نام عرفان ذات ہے حیات اپنی ذات کا عرفان حاصل کر چکا تھا اس لئے اب وہ بجائے مادی ترقی اور تعمیر کے روحانی عوامل اور عناصر پر مکمل توجہ مبذول کرتا تھا کیونکہ ایک مادیت پسند انسان آنکھیں کھول کر اردگرد کے حالات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے فکر و تدبر سے مسائل کا حل دریافت کرتا ہے اور ان مسائل کا حل دریافت کرنے کے بعد جہد مسلسل اور عمل پیہم سے منزل کی طرف بڑھتا ہے مگر ایک روحانی شخصیت یا درویشانہ روش رکھنے والی ہستی اپنی آنکھیں بند کر کے اردگرد کے حالات سے بے خبر، مسائل کا ادراک لئے بغیر، اور مسائل کا حل دریافت کئے بغیر اپنی دھن میں سفر کرتی رہتی ہے وہ اپنی تنہا دنیا کا مسافر بن کر چلتی رہتی ہے کہ کہیں کوئی اسکے حالات کے شیرازے کو نہ بکھیرے کیونکہ اسکی دنیا محض چند جذباتی اور روایتی لوگوں کی طرح نہیں ہوتی اور نہ ہی ایسی شخصیات سے کسی کے دل میں تحقیق و اکتشاف کی لہر پیدا ہوتی ہے حیات کی شخصیت ذاتی اغراض و مقاصد سے بلند ہو کر سب کی بھلائی کیلئے سوچنے اور مشورہ دینے والی تھی۔ اس سلسلے میں وہ رہنماؤں اور مقتدر طبقات کی توجہ خود احتسابی اور خود انتقادی کی طرف دلاتے رہتے تھے۔

قدرت کا قانون ہے کہ نادر اور قیمتی متاع ہمیشہ مختصر وقت کیلئے حاصل ہوتی ہے۔ عین شباب میں ہی حیات کو مختلف دماغی بیماریوں نے اپنے حصار میں لے لیا۔ حیات کا خاندان ایک مضبوط متوسط خاندان تھا جنہوں نے حیات کے علاج معالجے میں کبھی کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونے دی البتہ حیات کی خود فہمی اور دنیاوی زندگی سے بے اعتنائی اور دوسروں پر فیاضی کے بھی شاکی رہتے تھے۔

حیات اکثر انہیں ایک ہی جملہ کہہ دیتا کہ تمہیں پتہ چل جائے گا۔ حیات کی جوانی بے داغ اور فسق فجور سے پاک تھی وہ اپنے من کی مستی میں رہنے والا انسان تھا۔ اب بیماری کے ہاتھوں کبھی اگر بے بس بھی ہو جاتا تھا مگر اسکی خودداری اور انا اپنی جگہ پر ہر وقت برقرار رہتی تھی۔ مختلف سیکا ٹرسٹ اور میڈیکل سپیشلسٹ سے کئی معائنے کرانے کے بعد بھی حیات کی بیماری کا مکمل علاج نہ ہو سکا اور ان کا یہ مرض دن بہ دن بڑھتا گیا مگر ایک چیز جو نہ صرف اسکے لواحقین نے دیکھی بلکہ پورے رشتہ داروں اور اہل شہر نے محسوس کی کہ اتنی قوی شخصیت کو اتنی بڑی بیماری کے بعد بھی کسی نے نہ جسمانی طور پر کمزور ہوتے دیکھا اور نہ کسی نے ٹینشن یا ڈپریشن میں دیکھا بلکہ جب بھی کوئی اس سے طبیعت کے متعلق استفسار کرتا تو الحمد کہنے کے بعد اس کا دوسرا جملہ یہ ہوتا کہ میں تو بیمار ہوں ہی نہیں۔ مجھے کیا ہونا ہے۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا اور ایک دن حیات اپنی دماغی حالت کے باعث پہلے اپنے شہر پھر اپنے ضلعے اور پھر اپنے صوبے کے صدر مقام کے ہسپتالوں سے ہوتا ہوا وادی موت میں جا سویا اور سب کیلئے ایک انوکھا اور درد بھرا درس عبرت چھوڑ گیا کہ یہ زندگی عارضی ہے اسلئے مادیت پرستی کے بجائے روحانیت کی ترویج و اشاعت کیلئے کوشش کرنی چاہیے اور دوسروں کیلئے آسانیاں پیدا کرنی چاہئیں جو پوری عمر حیات کا وطیرہ رہا اور آج بھی جب میں سوچتا ہوں تو اس کا ہر موقع پر دہرائے جانے والا جملہ میری پلکوں کو بھگو دیتا ہے کہ، تمہیں پتہ چل جائے گا۔

نعتیں — تفاخر محمود گوندل

پہلی نظر

اس وقت نگاہوں میں ہے اللہ کا دربار
ہر سمت نظر آتے ہیں انوار ہی انوار
لبیک کی ہر وقت صدا گونج رہی ہے
روتے ہیں تڑپتے ہیں مچلتے ہیں خطاکار
اللہ کے اس گھر پہ ہیں قربان دل و جاں
کوئی بھی یہاں آ کے نہیں رہتا ہے نادار
نیت میں ہو اخلاص تو کعبہ کی زیارت
بتلاتی ہے انساں کو ہے کیا عظمتِ کردار
جب پہلی نظر پڑتی ہے اللہ کے گھر پر
اللہ کی رحمت کے نظر آتے ہیں آثار
بس خالقِ کونین کا یہ لطف و عطا ہے
اللہ کے گھر پہنچا تفاخر سا گنہگار

سمٹے ہوئے ہیں آنکھ میں انوارِ مصطفیٰ
نظروں کے سامنے ہے جو دربارِ مصطفیٰ
کیا ان دنوں ستارۂ قسمت ہے اوج پر
ہر وقت دیکھتا ہوں میں بازارِ مصطفیٰ
ہوتا ہوں روز و شب کو ریاضِ رسولؐ میں
ملتی ہے روز دولتِ دیدارِ مصطفیٰ
رکھتا ہوں روز سر کو میں پائے رسولؐ پر
بکتا ہے روز خود ہی خریدارِ مصطفیٰ
دیکھا تھا جو بھی عالمِ رؤیا میں بار بار
سب کچھ وہ پا چکا ہے طلب گارِ مصطفیٰ
بعد از وصال بھی ہیں رفیقانِ باصفا
اک یارِ غار، دوسرا شہکارِ مصطفیٰ
ہر لحہ اس قدر ہیں معطر مشامِ جاں
جیسے کھلے ہوں گیسوئے خمدارِ مصطفیٰ
کرتی ہے یہ تقاضا محبت حضورؐ کی
دل میں بسا لیں سیرت و کردارِ مصطفیٰ
پاتا ہے نصف شب کو تفاخر جو تابشیں
کرتے ہیں وہ عطا اُسے آثارِ مصطفیٰ

زندگی اور محبت

جواہرہ سعید قریشی

وہ دن اس کے لیے بے حد یادگار ہونا تھا، اس نے سوچا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھی کیوں کہ اس دن اس نے اپنی بیسویں سالگرہ منانی تھی، یہ اس کی ماں کے بغیر گزرنے والی تیسری سالگرہ تھی۔ وہ ماں کو بالکل بھی نہیں سوچتی تھی۔ ماں کا خیال آ بھی جاتا تو وہ اپنا دھیان ادھر ادھر بٹا لیتی، دھیان بٹانا اس کے لیے بہت آسان اس لیے بھی تھا اس کے اس گھر میں اس کے چچاؤں کے بیٹے بیٹوں کی بڑی فوج تھی۔ اس کی اس سالگرہ کا پروگرام اس نے اپنے اباجان سے خود طے کیا تھا اور کئی ہفتوں سے سارے گھر میں اس موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ ابا اور علینہ نے مل بیٹھ کر ایک زبردست پروگرام بنایا تھا اور اس میں غافیہ بیگم کو بطور گلوکارہ بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ علینہ کی سہیلیوں اور ہم جماعتوں کی بڑی تعداد بھی مدعو تھی۔ گویا ایک بڑی شاندار تقریب ہو رہی تھی۔ اکلوتی پھپھو کے سوا ہر کوئی اس تقریب میں شامل تھا اور خوش بھی تھا، پھپھو جان تھیں تو بہت صوبر اور لاڈ کرنے والی لیکن ان کا مسئلہ یہ ہوا کہ وہ علینہ کا رشتہ اپنے بیٹے یوسف کے لیے مانگ بیٹھیں۔ ابا نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس انکار سے سارا خاندان خوش تھا۔ یوسف تھا تو اپنے گھر کا بچہ لیکن وہ کسی طور بھی علینہ کے لائق نہ تھا۔ پھپھو کا بیٹا ہونا اتنی بڑی کوبی نہیں تھی کہ علینہ کو اس کے ساتھ کر دیا جاتا۔ وہ سے خاصا بگڑا ہوا لڑکا تھا، اس پر شکل صورت بھی واجبی سی۔ خاصا چھوٹا قد، پیٹ نکلا ہوا، دانت پیلے، بالوں کو تیل چوپڑتا تو سرسوں کی باس کسی کو پاس پھٹکنے نہ دیتی۔ ناک ایسی جیسے مرغی کا دو بندی انڈہ ٹکا دیا گیا ہو۔ آنکھیں اتنی چھوٹی کہ دور دکھائی ہی نہیں دیتیں۔ اب جناب جب ہنستے ہیں تو آنکھیں خود بخود بند ہی ہو جاتیں۔ بولنا بھی گنواروں جیسا چیخ چیخ کے بولتے اور تیز بولنے کی وجہ سے تھوک سامنے والے منہ پر جا پڑتا۔ دوسری طرف علینہ نک سک سی لڑکی، صاف رنگ، گول گول مغلوں والی آنکھیں، بنا مسکرائے بھی دیکھیے تو علینہ کی آنکھیں مسکراتی دکھائی دیتیں۔ نازک سے ہونٹ اور لمبے بال، قد بھی مناسب۔ یوسف سے قد میں بڑی تھی۔ البتہ دونوں کی دو باتیں مشترک تھی کہ دونوں اکلوتا تھے، دونوں کے والدین میں سے ایک فوت شدہ تھا۔ علینہ کی ماں تو یوسف کا باپ۔ علینہ کو نہیں علم تھا کہ یوسف کا رشتہ اس کی پھپھو نے مانگا ہے، البتہ یوسف کو معلوم تھا کہ علینہ کے ابا یعنی اس کے ماموں رشتہ دینے سے انکار کر چکے ہیں۔

ڈھائی بجے کے لگ بھگ ابا نے دفتر سے فون کیا کہ کوئی میٹنگ آ گئی ہے، وہ پانچ بجے تک ہی آ پائیں گے۔ انھوں نے علینہ سے کہا کہ فاروق چچا کے ساتھ جا کر سامان وغیرہ بھی لے آنا اور پارٹی میک اپ بھی کراتی آنا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور سات بجے کے لگ بھگ گھر پہنچی۔ ایک دو سہیلیاں آ چکی تھیں لیکن مہمانوں کو نو بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ مہمان جمع ہونے لگے، غافیہ بیگم اپنے سازندوں سمیت آن پہنچیں۔ لیکن اباجان کا کوئی اتا پتا نہیں۔ موبائل فون بھی بند جا رہا ہے، دفتر سے جعفر انکل آئے تو انھوں نے بتایا کہ اچانک دفتر میں ان کو رکنا پڑ گیا تھا لیکن اس وقت تک رکنا عجیب بات ہے۔ دفتر سے معلوم کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ چھ بجے وہاں سے اپنے ویسپا پر گھر کے لیے نکل گئے تھے۔ گھر کا راستہ چالیس منٹ سے زیادہ کا ہے نہیں۔ فاروق چچا، مہتاب چچا اور ان کے بچے ابو کی تلاش میں نکل گئے۔ ۲۰ پونڈ کا کیک بیکری والے نے لا کر لان میں بچھی میز پر جما دیا۔ ہر کوئی افسردہ اور فکرمند تھا۔ گیارہ بجے لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔ گھر والوں کے سوا سب رخصت ہو گئے، گرمی کے سبب کیک کی کریم پگھلنے لگی۔ غافیہ بیگم بھی رخصت ہوئیں۔ دو کا عمل ہو گا کہ معلوم پڑا کہ تایا جان کی لاش واٹسن کرسچین ہسپتال میں ہے۔ راستے میں لٹیروں نے ان کو لوٹنا چاہا۔ مزاحمت پر گولی چلی اور تایا جان شہید۔ تابوت میں تایا جان کا آدھا چہرہ روئی سے ڈھکا ہوا تھا۔

قیامت صور پھونکے بنا، علینہ کے صحن میں آ چکی تھی۔ خوشیوں سے مہکا گھر ماتم کدہ بن چکا تھا۔ علینہ والد کو تابوت میں دیکھ، غش کھا، بے ہوش ہو، ہسپتال جا پہنچی، ہوش جب آیا تو ابا کے قل کا دن تھا۔ اس کا خالی گھر دلاسے دینے والے سے بھرا ہوا تھا۔ اسے لگا کہ ماں تو آج مری ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد سے رونا تو اسے آتا تھا، سو جی بھر کے روئی۔ غم نے نڈھال کر دیا، کھلا ہوا چہرہ مرجھا گیا، دس دنوں میں رنگ ہلدی جیسا ہو گیا، آنکھوں کے سامنے حلقے پڑ گئے، ہونٹوں پر خاموشی کا تالا پڑ گیا۔ کھانا پینے کا ہوش نہ رہا، دادی کو ڈر لگا کہ کہیں بیٹے کے ساتھ پوتی کو بھی زمین کے حوالے نہ کرنا پڑے۔ خود ڈاکٹروں، حکیموں اور سنیاسیوں کے پاس لے دوڑی۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اس مرض کا علاج صرف اور صرف وقت کے پاس ہے اور وقت گزرتے گزرتے گزرتا ہے۔

چہلم کی شام کو مہمان رخصت ہو گئے تو پھپھو نے دادی کو بٹھا، یوسف کے رشتے کی بات چھیڑ دی، علینہ وہیں برامدے میں بیٹھی تھی، فاروق چچا نے بہن کو گھورا، دادی نے بات علینہ پر چھوڑ دی، علینہ کو پھپھو نے مخاطب کیا تو وہ جاگی لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے پائی، یا اس نے اس بات کا کوئی جواب دینا مناسب ہی نہ جانا۔ وہ پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گئی۔ اللہ جانے کس کس کو یہ معلوم تھا کہ علینہ کے اس رشتے کو ایک دفعہ نہ کی جا چکی ہے۔ وہاں کسی نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی اور یہ بھی خود پھپھو نے بھی اس حوالے سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ دادی کو بھی لگتا ہے اس کہانی کا علم نہیں تھا۔ اب جو حالات تھے اس میں پھپھو کا یہ رشتہ مانگنا ہر کسی کو مناسب لگا اور جوان جہان لڑکی کو پھپھو کے حوالے کر دینے میں سب نے عافیت جانی۔ جب ہر کوئی خاموش ہی رہا، تو اعظم خالو بولے

لالہ نے علینہ کے رشتے سے آپاں کو منع کیا تھا۔سکینہ بوا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔تائی فرحت نے بھی کہا کہ ہاں مجھے بھی اس بات کا معلوم ہے۔ اب وہاں برامدے میں بیٹھے سبھی بول اٹھے۔علینہ کی پھپھو نے اونچی آواز میں سب سے کہا کہ میرا بیٹا علینہ کے لیے مناسب ترین رشتہ ہے۔اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے اور یوسف اپنی علینہ کو خوش رکھے گا اور گھر کا بچہ ہے۔یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا آپ سب کا فرض ہے۔لالہ زندہ ہوتا تو انکار کرتا یا اقرار، وہ اور بات تھی۔اب لالہ ہمارا حق کی راہ چلا۔جوان لڑکی کو کون سنبھالے گا، ماں جی اللہ آپ کو رکھے لیکن یہ بھاری ذمہ داری آپ کے ہی سر ہے۔علینہ وہاں بیٹھی تھی لیکن وہ وہاں تھی نہیں۔ماں جی بولیں ''بیٹی! تو بھی تھوڑا سا حوصلہ کرنا۔۔۔وہ دیکھ بدنصیب کیسی اجڑی بیٹھی ہے۔سدھ بدھ نہیں۔ایسے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا جلد بازی ہوگا۔''اعظم خالو نے کہا علینہ ہماری بیٹی ہے اور اس کے مستقبل کے بارے میں ہم سب نے مل کر سوچنا ہوگا۔دادی نے کہا میں اپنے پانچوں بیٹوں سے بات کروں گی علینہ سے بھی پوچھوں گی پھر ہی کوئی فیصلہ ہو پائے گا۔پھپھو کا خیال تھا کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو جائے۔انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ حواس والی علینہ کبھی بھی یوسف کو قبول نہیں کرے گی۔یہ دل کی بات پھپھو کسی سے بھی نہیں کر سکتی تھیں۔اب انھوں نے سوچا کہ اپنی ماں کو ہم راز کر لوں شاید علینہ کا رشتہ مل جائے۔رات جب ماں جی تہجد کے لیے جاگیں تو پھپھو ان کی جائے نماز پر آن بیٹھیں اور دل کی بات کہہ دی۔ماں جی نے خاموشی سے بات سنی اور بالکل بھی نہ بولیں۔پھپھو خاصی دیر ان کا منہ دیکھتی رہیں او پھر اپنا سا منہ لیے وہاں سے اٹھ گئیں۔ایک مہینہ اور گزر گیا اور علینہ اس ذہنی دباو سے باہر نہ نکل سکی۔علینہ کے لیے ایک دو اور بھی امیدوار سامنے آ گئے۔علینہ کی خرابی صحت اب سب کو کھٹکنے لگیں اور کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جانے کی صلاح ٹھہری۔ہاں اس سارے عرصے میں پھپھو علینہ کا خاصا خیال رکھتی رہیں جیسے وہ ان کی ہی بہو ہو۔یوسف کے علینہ کا رشتہ ان کی آخری خواہش بن چکا تھا۔ ماں جی نے جب حالات دیکھے اور باقی دو علینہ کے رشتے کے خواہشمند کو بھی بلا بھیجا اور کھل کر بات کی۔پھپھو نے شدید احتجاج کیا کہ ان کا حق پہلے ہے۔ ماں جی نے کہا تمہارا حق پہلے ہی تھا، اگر تمہیں علینہ کے باپ تیرے اپنے بھائی نے انکار نہ کیا ہوتا۔سب کے سامنے ایسی توہین پر پھپھو خفا ہو کر اٹھ گئیں۔دوسری طرف علینہ کا علاج شروع ہوا، ادویات کے شروع ہوئے ابھی مہینہ ہی گزرا تھا کہ علینہ کے حواس بحال ہونے لگے اور اعظم خالو اور فاروق چچا کی موجودگی میں ماں جی نے اس سے تینوں رشتوں کے بارے میں پوچھا اور علینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔تھوڑی دیر یہ مجلس چلتی رہی اور بالآخر قرعہ یوسف کے نام نکلا۔پھپھو نے بکرا منگوا ، ذبح کیا اور سارے محلے میں بانٹ دیا۔علینہ وہ علینہ نہیں تھی۔علینہ ایک بے جان گڑیا یا مٹی کا بت تھی، کسی بھی جذبے سے عاری اور کسی سے بات کرنے سے بے زار۔اس کو تو رتی بھر پرواہ نہ تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔دوسری طرف یوسف اور اس کی ماں کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔شادی کی تیاری شروع کر دیں۔چار ماہ بعد کا وقت طے ہو گیا البتہ نکاح کر دیا گیا، علینہ نکاح کے وقت روئی ضرور تھی، جانے اپنی قسمت کو یا اپنے والدین کو۔

یوسف کے ساتھ شادی کو تین سال گزر گئے۔ چھوٹا ودود اب باتیں کرنے لگا۔اس کے ساتھ ہی علینہ نے بھی بولنا شروع کر دیا۔یوسف کو اپنا گھر جنت لگنے لگا۔علینہ کی نظروں میں اس کے لیے محبت تو شروع دن سے تھی لیکن علینہ اس کے سات گھل مل نہیں رہی تھی۔اب ودود نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا اور خود ان کی گرہ بن گیا۔شادی کے دن سے ہی خاندان والوں کا ہی کیا محلے والے، جان پہچان والے یہی کہتے تھے کہ ''لنگور کو حور مل گئی''۔یوسف ولیمے والے دن جب اس کے ساتھ آ کے بیٹھا، تو اس کے پیلے دانت دیکھ مہمانوں کو یقین تھا کہ یہ پری اس کے ساتھ ایک دن نہیں رہے گی۔پری کا چہرہ بھی یہی بتلا رہا تھا کہ وہ اس بن مانس کے ساتھ نہیں گزارہ کر پائے گی۔لوگ یہ بھول چکے تھے کہ پری کا تو وہ پھوپھی زاد تھا۔علینہ نے اپنی اور خاندان کی عزت کا پالن کیا اور یوسف کو خاوند کے بجائے اپنا دوست مان لیا اور زندگی کا یہ کڑوا گھونٹ اتنی خوش دلی سے پیا کہ زندگی خود حیران رہ گئی۔اس کی پکی سہیلی نے جب برات والے دن اس لنگور کو دیکھا تو وہ اس ہال میں پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔علینہ کے پاس آئی اور کچھ بولنا چاہا تو علینہ نے غصہ کرتے ہوئے اسے کہا ''حرا! پلیز۔۔۔۔یوسف میرا خاوند ہے۔'' حرا جانتی تھی کہ علینہ کیا کہہ رہی ہے۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شادی کے پہلے مہینے میں ہی یوسف بدلنے لگا، اس کے دانت سفید ہوتے گئے، بالوں کو وہ ہر پندرہ دنوں بعد ترشوانے لگا، ورزش خانے جانے لگا۔چینی اور میٹھا چھڑوا دیا گیا۔چیخ چیخ کے بولنے سے بھی گریز کرنے لگا۔روز کے روز کپڑے بدلتا اور ہاتھ میں رومال بھی رکھنے لگا۔جوتے بھی پالش ہوئے ہوتے۔پھپھو جب یہ دیکھتیں تو علینہ کو دعائیں دیتیں۔ماں جی نواسے اور پوتی کو ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھتیں تو اللہ کا شکر ادا کرتیں لیکن علینہ کی بدن بولی میں ایک اداسی تھی، جس کا مداوا ودود بنا۔اس کے ماتھے کی بنکیا میں اضطراب تھا، جس کو ودود کی ہنسی چاٹ گئی۔اس کی چوڑیوں کی کھنک ایک ڈر تھا جس وک ودود کے وجود نے مار دیا۔اس کی پازیب کی چھن چھنا چھن کی آواز میں غم کی جھنکار تھی جس کو یوسف کی چاہت محو کر گئی۔ ودود کی مسکان ، علینہ کا قہقہوں کو کہیں سے ڈھونڈ لائی۔ دوسری یوسف کی واجبی صورت خوش شکل سی ہو گئی تھی۔عورت کے ہاتھ نے یوسف کو سنوار دیا تھا۔یوسف کے چلنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، غرض ہر انداز میں علینہ کے سگھڑ پن اور خوش سلیقگی دکھائی دے رہی تھی۔محبت کے سو رنگ ہوتے ہیں اور وہ سو کے سو رنگ یوسف کو میسر تھے۔یوسف کی محبت نے علینہ کو زندگی کے معنی سمجھا دیے اور یوسف کو علینہ تو پہلے سے جیت ہوئی تھی۔

جلال الدین خوارزم شاہ سندھ میں

مرزا کاظم رضا بیگ

سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی سندھ میں آمد تاریخ سندھ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کی سلطنت عراق سے لے کر چین کی سرحد تک اور کابل سے مغربی ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو اپنی حکومت کے دوران تاتاری یلغار کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی پوری زندگی معرکہ آرائیوں میں گزری۔ یہاں تک کہ وہ سنہ 617ھ میں جزیرہ آب سکوں میں مر گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے جلال الدین خوارزم شاہ نے اس کی حکومت سنبھالی۔ اس کے حکومت سنبھالتے ہی اس کے اور اس کے بھائیوں کے درمیان اختلافات کا زنجیرہ کھل گیا۔ اس بنا پر اس نے خوارزم شاہ کی سکونت ترک کر دی۔ اسی دوران چنگیز خان نے خوارزم شاہ پر یلغار کر دی اور وہاں کے حکمرانوں کو معہ خدم و حشم کے گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ اس سے پہلے چنگیز خان نے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ لاکھوں انسانوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے ظلم و جور، اس کی سفاکی اور بربریت کی آگ فرو نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عذابِ الٰہی چنگیز خان کی صورت میں پورے وسطی ایشیا میں مسلط ہو گیا ہے۔ خوارزم اور سمرقند کی فتح کے بعد اس نے ترمذ پر فوج کشی کی۔ ترمذ کے باشندوں نے شہر کے دروازے بند کر دیے تھے۔ اس نے ان کو یقین دلایا تھا کہ اگر انہوں نے قلعہ اور فصیل کو منہدم کر دیا اور شہر کے دروازے کھول دیے تو ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے چنگیز خان کی چیرہ دستی اور سفاکی کے واقعات سن رکھے تھے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا، جس پر اس نے ان کو زبردست نقصان پہنچایا۔ ترمذ پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے پوری آبادی کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد بدخشان کی راہ لی۔ بدخشان کے بعد بلخ پہنچا۔ بلخ کے باشندوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی، لیکن چنگیز نے اعتماد نہ کرتے ہوئے بلخ کے تمام باشندوں کی لاشوں کے پشتے لگا دیے۔ اس وقت جلال الدین خوارزم شاہ، غزنی میں موجود تھا۔ بلخ سے غزنی کی مسافت زیادہ نہیں تھی۔ چنگیز خان نے اپنے لشکریوں کو اس کے تعاقب کا حکم دیا اور خود غزنی پہنچ گیا، جہاں اسے معلوم ہوا کہ جلال الدین خوارزم شاہ ہندوستان کے ارادے سے روانہ ہو چکے ہیں۔ چنگیز خان نے اس کا تعاقب جاری رکھا، اس وقت جلال خوارزم شاہ نے دریائے سندھ تک مسافت انتہائی تیزی سے طے کر لی تھی اور چنگیز خان نے اس کو گھیرے میں لے لیا۔ جلال الدین خوارزم شاہ کے پاس بہت مختصر سی سپاہ تھی۔ اس سے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس مختصر سی سپاہ کو لے کر چنگیز خان کے ہزاروں لشکریوں کا مقابلہ کرتا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے یا تو چنگیز خان کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے یا دریا میں ڈوب مرے۔ اس نے اس موقع پر انتہائی بہادری کا مظاہرہ کیا اور اپنی زندگی پر کھیل کر اپنے گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا اور تیزی سے تیرتا ہوا نکل گیا۔ چنگیز کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اپنے بیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا کہ ہر باپ کا بیٹا جلال الدین خوارزم شاہ جیسا ہونا چاہیے۔

جلال الدین خوارزم شاہ کی یہ شکست اور فرار نے اس کی اولوالعزمی اور بہادری کو مزید جلا دی۔ اس کو توقع تھی کہ ہندوستان کا فرمانروا سلطان شمس الدین التمش اس کی مدد کرے گا لیکن اس نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ وہ مایوس ہو کر لاہور کے متصل پہنچا تو وہاں اس سے اس کے دس ہزار لشکری آ ملے جو اس سے الگ ہو گئے تھے۔ اس نے ان ہی پر انحصار کیا اور ان کی مدد سے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانا چاہا۔ چنانچہ اس نے کھوکھروں کو شکست دی اور کثیر مال غنیمت لے کر واپس ہوئے۔ پھر جلال الدین نے کھوکھروں کے راجہ سے اس کی بیٹی کا رشتہ اپنے لیے طلب کیا۔ اس راجہ نے اس کا یہ مطالبہ نہ صرف منظور کیا، بلکہ اپنے لڑکے کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی جمعیت اس کے حوالے کر دی۔

کھوکھروں کے راجہ اور اُچ اور ملتان کے فرمانروا صدر الدین قباچہ کے درمیان عرصہ سے عداوت چلی آ رہی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کھوکھروں کے راجہ نے جلال الدین خوارزم شاہ کو ناصر الدین قباچہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ جلال الدین اپنے مقبوضات میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک سپہ سالار اوزبک تائی کی سرکردگی میں ایک فوج اُچ کی طرف روانہ کی۔ ناصر الدین قباچہ نے اُچ سے تین میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے اپنے بیس ہزار سپاہیوں کے کیمپ لگا رکھے تھے۔ اوزبک تائی کے ہمراہ صرف سات ہزار لشکری تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ان لشکریوں سے مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے مقابل کے بجائے قباچہ کے لشکریوں پر شب خون مارا۔ یہ صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔ قباچہ کے لشکری شکست کھا کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ قباچہ کے لیے یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس نے اسی وقت کشتی میں سوار ہو کر بھکر کی راہ لی۔ اس کے بعد اوزبک تائی کے لیے اُچ کی فتح آسان ہو گئی۔ وہ انتہائی اطمینان کے ساتھ قباچہ کے فوجی کیمپوں میں داخل ہوا۔ وہاں جتنے بھی سپاہی رہ گئے تھے ان کو قید کر کے جلال الدین کو اطلاع بھجوائی کہ اُچ بھی فتح ہو گیا ہے۔ قباچہ نے بھکر سے ملتان کا قصد کیا۔ ابھی وہ ملتان پہنچا ہی تھا کہ اُسے جلال الدین کا فرمان ملا، جس میں اس سے کہا گیا تھا کہ وہ خراج ادا کرے۔ قباچہ کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ اس کا ہر مطالبہ منظور کرے۔ قباچہ نے اس کا ہر

مطالبہ پورا کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے علاقوں کو مزید نقصان نہ پہنچائے۔ جلال الدین نے اسے یقین دلایا کہ اس کے علاقوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ اس کے بعد اس نے موسم گرما گزارنے کے لیے کسی سرد مقام کی راہ لی۔ جب وہ قلعہ راوڑ کو فتح کرنے کے بعد گزر رہا تھا تو کسی مخالف سپاہی کے تیر چلنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ اس نے اس غلطی کی سزا قلعہ والوں کو یہ دی کہ ان سب کو قتل کرا دیا۔ اسی دوران چنگیز خان، جلال الدین کو ڈھونڈتا ہوا سندھ میں داخل ہو گیا اور قباچہ پر ٹوٹ پڑا۔ قباچہ کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ چنگیز خان کی یلغار کا سامنا کرتا۔ اس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ وہ ملتان کے قلعہ میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جائے۔ چنگیز خان کے لشکریوں نے چالیس دن سے زائد قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا، لیکن ان کی ایک بھی نہ چلی، چونکہ قباچہ نے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے اپنے تمام خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ اس لیے انہوں نے بڑی بہادری اور دلیری کے ساتھ مزاحمت کی جس سے مایوس ہو کر چنگیز خان کے لشکر کو بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔

چنگیز خان کے واپس جانے کے بعد جلال الدین کی جان میں جان آئی تو اُس نے ملتان سے گزرتے ہوئے قباچہ سے اس رقم کا مطالبہ کیا جو اس کے علاقے کو تاخت و تاراج سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی جانب سے دی جانے والی تھی قباچہ نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ اس نے پہلی مرتبہ خراج ادا کر کے غلطی کی تھی۔ اب اگر اس نے یہ مطالبہ پورا کر دیا تو پھر اس کے سارے خزانے، مطالبے پورے کرنے میں خالی ہو جائیں گے۔ اس نے بڑی سختی سے انکار کیا اور کہا کہ اگر جلال الدین کو جنگ ہی کی خواہش ہے تو پھر میں بھی مقابلہ پر آتا ہوں۔ قباچہ کو اپنے لشکریوں کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ وہ فوری مقابلے کے لیے نکل آیا۔ ملتان سے کچھ فاصلے پر اس کے اور جلال الدین کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی، لیکن جلال الدین شکست کھا کر اُچ کی طرف نکل گیا۔ جب اُچ کے لوگوں نے جلال الدین کی ناکامی اور شکست کے اطلاعات سنے تو دلیر ہو گئے۔ انہوں نے اس کو فاتح تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر جلال الدین خوارزم شاہ نے مشتعل ہو کر پورے شہر کو آگ لگا دی اور سیہون کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت سیہون پر فخر الدین سالاری کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے سپہ سالار لاچین ختائی کو جلال الدین کے مقابلے کے لیے بھیجا، لیکن لاچان ختائی کے قتل کے بعد میدانِ جنگ کی حالت بدل گئی۔ جلال الدین نے آگے بڑھ کر پورے سیہون کا محاصرہ کر لیا اور آمد و رفت کے تمام وسائل محدود مسدود کر دیے۔ اس صورت حال سے پورے شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ لوگ فاقہ کشی سے تنگ آ کر خود فخر الدین سالاری کے در پے ہو گئے۔ اس نے صورت حال کو بھانپ لیا اور اسی وقت جلال الدین کی خدمت میں پہنچ کر اپنی تلوار اس کے قدموں میں ڈال دی۔ جلا الدین خوارزم شاہ اس کی اطاعت کشی پر بہت خوش ہوا۔ پھر ایک ماہ قیام کرنے کے بعد جب واپس جانے لگا تو سیہون کی حکومت دوبارہ فخر الدین سالاری کے حوالے کر دی۔ سیہون سے نکل کر جلال الدین نے دیبل کے قریبی علاقوں پر توجہ دی اور دیبل کے راجہ کو جب یہ علم ہوا کہ جلال الدین اس پر حملہ کی غرض سے اس کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے تو خوف سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ انتہائی بدحواسی کی حالت میں کشتی میں بیٹھ کر سمندر کے راستے کسی نامعلوم مقام کی طرف فرار ہو گیا۔ جلال الدین نے اس کے علاقوں میں پہنچ کر دیبل کے متصل اپنے خیمے نصب کیے۔ شہر کا جائزہ لیا۔ اس جائزے کے دوران بے شمار دولت اس کے ہاتھ آئی اور اسے اپنے لشکریوں کو خورسند اور مستعد رکھنے کا موقع ملا۔ اس نے دیبل میں قیام کے دوران خاصی خان کی سرکردگی میں نہروالا کی طرف اپنی ایک فوج بھیجی۔ خاصی خان نے نہروالا پر چڑھائی کی اور وہاں سے بے شمار ساز و سامان اور بھاری تعداد میں اونٹ لے کر واپس لوٹا۔ جلال الدین نے اس کی دلیری اور بہادری کی بڑی تعریف کی۔ پھر دیبل کے بت خانہ کے مقام پر ایک جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کے حکم پر چند ہی دنوں میں ایک عالی شان مسجد تعمیر ہو گئی اور اس میں اس کے لشکری باجماعت نماز ادا کرنے لگے۔ اس کے بعد اس نے منصورہ اور اس سے ملحقہ علاقوں پر بھی قبضہ کر جما لیا۔

جلال الدین خوارزم شاہ سنہ 621ھ میں سندھ کی مہم سے فراغت پانے کے بعد کرمان کے راستے سے عراق پہنچا اور پھر اس نے اپنی لیاقت اور تدبر سے اپنی فوجی استعداد اس قدر بڑھائی کہ فارس، گرجستان، عراق، آذر بائی جان اور خلاط کے علاقے اس کی تحویل میں آ گئے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو گیا۔ اگرچہ اس زمانے میں چنگیز خان مر چکا تھا، لیکن اس کے لشکری جلال الدین کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جب وہ خلاط میں تھا تو چنگیزی لشکریوں کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا۔ جلال الدین نے اپنے سپہ سالاروں سے کہا کہ تم اس دستہ کو اس وقت تک لڑائی میں مصروف رکھو جب تک کہ میں نہ نکل جاؤں۔ چنانچہ وہ خلاط سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور بڑی مشکل سے میاں فارقین کے ایک قصبہ میں پناہ لی۔ چنگیزی لشکری یہاں بھی پہنچ گئے۔ یہاں سے نکل کر وہ کسی اور مقام کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں کردوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے کہا کہ میں جلال الدین ہوں، تمہیں اتنے خزانے دوں گا کہ تم کو زندگی بھر لوٹ مار کی ضرورت نہیں ہو گی۔ کردون کے سردار نے اس کی جان بخشی کی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اس سردار کے بھائی نے پہنچ کر بتایا کہ یہ جلال الدین تو ہمارے باپ کا قاتل ہے۔ لہٰذا کردون نے اسے سنہ 626ھ میں قتل کر دیا۔

ادبی خبریں

✦ 18 اگست بروز اتوار 84 سالہ شاندار روایات کا اثاثہ رکھنے والے قدیم اور معتبر ترین ادبی ادارہ ''حلقہ اربابِ ذوق لاہور'' کا تازہ اجلاس معروف اور سینئر تخلیق کار جناب سلمان باسط کی زیر صدارت پاک ٹی ہاؤس میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں محترمہ شبہ طراز نے اپنا افسانہ اور جناب احسان الحق مظہر نے غزل تنقید کے لیے پیش کی۔ دونوں تخلیقات پر شرکاء اجلاس نے نہایت عمدہ گفتگو کی۔ آخر میں جناب صاحب صدر سلمان باسط اور اسلام آباد سے تشریف لائے ہوئے مہمان شعراءِ کرام جناب ڈاکٹر عابد سیال اور جناب سجاد اظہر سے اُن کی شاعری سنی گئی۔

(رپورٹ: نواز کھرل) جنرل سیکرٹری حلقہ اربابِ ذوق لاہور

✦ ریڈیو پاکستان لاہور کے زیر اہتمام بسلسلہ جشنِ آزادی پاکستان خصوصی محفلِ مشاعرہ ''میری پہچان پاکستان'' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ اس پروگرام کے ایگزیکٹو پروڈیوسر ابرار ندیم پروڈیوسر غزالہ ضیا اور میزبان رابعہ رحمٰن تھیں۔ جن شعراء نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں دلشاد نسیم، رابعہ رحمٰن، حسن عباسی، لبنیٰ صفدر، تیمور حسن تیمور، فخر عباس اور صغیر احمد صغیر شامل تھے۔

✦ اسلوب انٹرنیشنل کے زیر اہتمام جناب منظر اعجاز کے شعری مجموعے ''میں اور باغ'' کی تقریب پذیرائی اور مشاعرہ کا اہتمام تنظیم کے روح و رواں اکمل حنیف نے آیان پیلس بحریہ ٹاؤن میں کیا۔ صدارت نوید صادق نے کی۔ شعرائے کرام میں اکمل حنیف رانا اسد علی، رائے ظہیر ایڈووکیٹ، ڈاکٹر فخر عظیم، سید تیمور کاظمی، حافظ صادق فدا، عاصم بخاری، مرزا سکندر بیگ، اشرف علی اشرف، وسیم عباس اور احتشام حسن شامل تھے۔

✦ ادبی و ثقافتی تنظیم زاویہ، احمد فراز ٹرسٹ کے زیر اہتمام اور ادارہ فروغِ قومی زبان کے تعاون سے عہد ساز شاعر جناب احمد فراز کی سولہویں برسی کے حوالے سے 25 اگست 2024ء ٹھیک 11 بجے ان کی آخری آرام گاہ H-8 قبرستان پر فاتحہ خوانی ہوئی اور پھولوں کی چادر کے ساتھ دُعا کی گئی۔ بعد ازاں ادارہ فروغِ قومی زبان میں ممتاز شاعر اور دانش ور ڈاکٹر احسان اکبر کی صدارت میں ایک باوقار اور بھرپور تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں جڑواں شہروں کے ممتاز اہلِ قلم اور فراز صاحب سے محبت کرنے والوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی جناب جلیل عالی اور ڈاکٹر محمد سلیم مظہر اور مہمان اعزاز جناب محمد حمید شاہد اور محترمہ فریدہ حفیظ تھے جنہوں نے اپنی گفتگو میں شاندار خراج پیش کرتے ہوئے فراز صاحب کو عصر حاضر کی نمائندہ اور بے حد توانا آواز قرار دیا جس کے اثرات اردو شاعری پر ہمیشہ باقی رہیں گے۔ تقریب کی نظامت زاویہ کے روح و رواں محبوب ظفر نے ادا کیے۔ دیگر اظہارِ خیال اور انہیں منظوم خراج پیش کرنے والے احباب میں جناب سعدی فراز، جناب نسیمِ سحر، جناب منظر نقوی، جناب ابرار حسین، ڈاکٹر فرحت عباس، جناب شاہد مسعود، جناب محسن شیخ، جناب شہاب صفدر، جناب شاہ نواز سواتی، جناب اشرف صدیقی اور دیگر نے فن و شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی۔

✦ پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان کے اشتراک سے جشن آزادی کے موقع پر کراچی میں خصوصی مشاعرہ ''کشور حسین شاد باد'' کا اہتمام کیا گیا۔ اس مشاعرے میں شہر کراچی کے نمائندہ شعراء و شاعرات نے شرکت کی۔ پاکستان ٹیلی وژن اور ریڈیو پاکستان کی ایک بہت عمدہ روایت یہ بھی ہے کہ ان کے مشاعرے میں معززین شہر بطور سامعین موجود ہوتے ہیں۔ اس مشاعرے کی صدارت جناب سحر انصاری نے کی جب کہ نظامت کے فرائض آئرن فرحت اور عنبرین حسیب عنبر نے ادا کیے۔

✦ ہزارہ اباسین آرٹس کونسل ایبٹ آباد کے زیر اہتمام جشنِ آزادی کے سلسلے میں ایک ملی مشاعرہ اباسین ہال جلال بابا آڈیٹوریم میں منعقد ہوا جس کی صدارت معروف شاعر و ادیب جناب امتیاز الحق امتیاز نے کی۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر سیٹلمنٹ و ریونیو جناب اسد محمود لودھی مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک محفل تھے۔ نظامت کے فرائض کونسل کے مشیر ادبیات عبدالوحید بسمل نے ادا کیے۔ مشاعرے میں ایبٹ آباد، حویلیاں اور نواں شہر سے شعراء کرام شریک تھے۔ جن میں جاوید ساگر، امین صادق، سہیل صمیم، سید شبیر حسین کاظمی، مدنی اعجاز مدنی، احمد ریاض، شکیل اعوان، سید ازہر بخاری، عبدالوحید بسمل، ملک ناصر داؤد، قاضی ناصر بختیار خان، ضیاء شاہد اور صاحب صدارت امتیاز الحق امتیاز شامل تھے۔

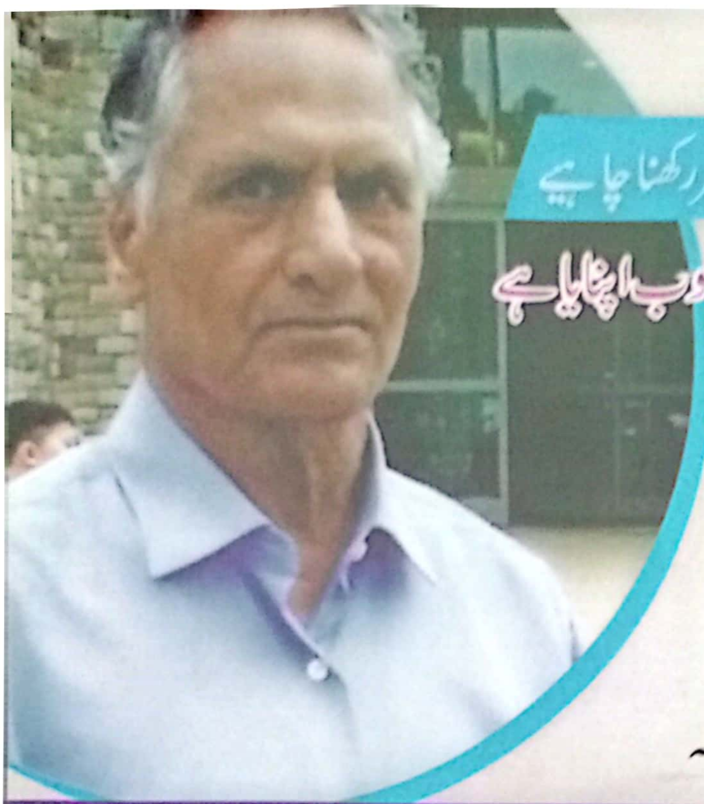

ایک مثالی تخلیق کار کو قاری کی خواہشات اور جستجو کو مدِنظر رکھنا چاہیے

میں نے اپنے سفرناموں میں اپنا ایک خاص اسلوب اپنایا ہے

معروف ادیب، مصنف، سفرنامہ نگار

فقیر اللہ خاں

سے معروف شاعرہ، کالم نویس اور مدیرہ ارژنگ **لبنیٰ صفدر** کا مکالمہ

کوئلے کی کانوں سے ہیروں کو دریافت کرنا اور اُن کو خوبی سے تراشنا شاعری کا اوجِ کمال ہے

ارژنگ: بچپن سے ملازمت تک کا سفر کب، کہاں اور کیسے گزرا؟

فقیر اللہ خاں: مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ پاکستان اور یہ ناچیز ہم عمر ہیں۔ بلکہ میں پاکستان سے دو ماہ بڑا ہوں۔ وہ اس طرح کہ میری پیدائش جون میں ہوئی اور پاکستان اگست میں معرضِ وجود میں آیا۔ والد صاحب اس وقت ضلع لاہور کے ایک ٹاؤن کوٹ رادھا کشن میں ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس طرح تعلیمی ماحول میں پرورش پائی۔ پرائمری کلاسز کے ایام میں ہی گھر میں ہمارے لیے بچوں کے رسالے باقاعدگی سے آتے جو زیرِ مطالعہ رہتے۔ تیسری کلاس میں موسمِ گرما کی چھٹیوں کے دوران بانگِ درا مکمل پڑھ لی۔ بعد ازاں حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا شاہنامہ اسلام زیرِ مطالعہ رہا۔ مڈل کلاسز میں والد صاحب نے دیوانِ غالب دیا، وہ بھی پڑھا۔ فیروز اللغات سے بھی آشنائی ہوئی۔ اسی طرح ادبی رجحان بچپن سے ہی پروان چڑھتا رہا۔

میٹرک میں امتحانات میں اردو فیورٹ مضمون تھا اور اس میں نمایاں پوزیشن حاصل کرتا۔ میٹرک کے بعد لاہور کی تاریخی درس گاہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں داخلہ لیا۔ کالج میں مولانا علم الدین سالک جیسے مشہور استاد سے کسبِ فیض کیا۔ مولانا علم الدین سالک کشمیری راہنما شیخ عبداللہ کے بھی استاد رہے ہیں۔ میرا پہلا مضمون کالج کے مجلّہ ''کریسنٹ'' میں انگلش میں چھپا۔ انٹر کرنے کے بعد ہیلی کالج آف کامرس (پنجاب یونیورسٹی) میں داخلہ لیا اور بی کام (آنرز) کے بعد ایم کام کی ڈگری حاصل کی۔ دورانِ تعلیم کالج کی سرگرمیوں کی رپورٹنگ روزنامہ ''مشرق'' میں شائع ہوتی رہتی۔ کالج میں لٹریری سوسائٹی کا فعال رکن تھا۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

وائس چانسلر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کو معروف مصنف فقیر اللہ خاں اپنی تصانیف پیش کر رہے ہیں

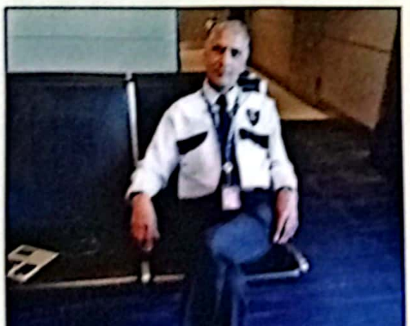

JFK ایئر پورٹ نیویارک میں ڈیوٹی کے دوران

واشنگٹن میں ایک لائبریری کے سامنے

"بار ایسوسی ایشن" اور "دیا لٹریری فورم" میاں چنوں کے زیر اہتمام

عامر بن علی کے پانچویں سفرنامے مشرق کی طرف دیکھ کی تقریب پذیرائی و مشاعرہ

صدارت: قمر رضا شہزاد — اہتمام: اسد عباس اسد — نظامت: ندا فاطمہ، راجز ودوان

فاروق طراز، طاہر تسیم، نواز ظفر، دانش نقوی، صفدر صفی، عدنان آصف بھٹہ، پروین نقش، زریں منور، راجز ودوان، ثاقب مشتاق ڈوگر، عمران مانی، اسامہ حیدر، رضا جعفری اور سردار انصاف نے اظہار خیال کیا۔ تلاوت رانا علی حیدر اور نعت محمد احمد ایڈووکیٹ نے پیش کی۔ صدر بار چوہدری عاصم آرائیں اور جنرل سیکرٹری ملک محمد عارف نے شعراء اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

مصنف نے مہمانوں کو کتب پیش کیں

مشاعرہ نے تقریب پذیرائی کا رنگ دوآتشہ کر دیا

سامعین میں وکلاء کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگ شامل تھے

شرکاء کا انہماک

مہمان شعراء کے لیے عشائیے کا اہتمام کیا گیا

FEEL FREE TO READ ONLINE
www.amirbinali.com

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com